SEPTEMBER 2007

ماہنامہ

فلاحِ آدمیت

گوجرانوالہ

Reg: CPL No. 80

ستمبر
2007

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا

صداقت — اللہ — محبت

سِلسلہ عالیہ توحیدیہ

ہے عرش بھی نیچا جو ہو پروازِ مسلسل

☆ موجودہ دور کے عظیم صوفی اور بانی سلسلہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی تعلیم کا علمبردار۔

☆ رُہبانیت اور شرک سے پاک اور قرآن وسنت کے عین مطابق راہ فقر کی تعلیم کا داعی۔

☆ وحدتِ اُمت، اکرام انسانیت اور فلاح آدمیت کا ترجمان۔

☆ فرقہ واریت، غصہ اور نفرت ختم کر کے عالمگیر محبت اپنانے کا نقیب۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

منشور دعوت

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِیْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِیْفَةً
وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ
وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِیْنَ ط

الاعراف ۔ 205

ترجمہ

اپنے رب کو اپنے دِل میں عاجزی اور ڈر کے
ساتھ، اُونچی آواز نکالے بغیر، صبح وشام
یاد کرو۔ اور غافلوں میں سے نہ ہونا۔

بیادگار **خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ**
بانی سلسلہ

نگران وسرپرست
محمد صدیق ڈار توحیدی صاحب
شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ

ماہنامہ **فلاحِ آدمیت** گوجرانوالہ
عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح وفلاح کا علمبردار

جلد 10 شمارہ 12 ستمبر 2007ء شعبان 1428ھ

ایڈیٹر **وحید احمد**

قیمت ——— 20/- روپے　　سالانہ فنڈ ——— 200/- روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:
محمد صدیق ڈار توحیدی
مرکز تعمیر ملت نزد توحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ
Ph:055-3862835
Mob: 0300-6493335

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:
وحید احمد
تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ
Ph:055-3881379
Mob:0300-7409533

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراجدین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپواکر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-55-4222020
E-mail: tohidia@hotmail.com

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

درس قرآن

(ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰؒ)

الانفال

نام! انفال نفل کی جمع ہے جس کا معنی ہے مالِ غنیمت ۔اس سورۃ میں چونکہ مالِ غنیمت سے متعلق احکام کا ذکر ہے،اس مناسبت سے اس سورۃ کا نام ''الانفال'' رکھا گیا ہے۔

زمانہ نزول! یہ سورۃ مدینہ طیبہ میں جنگِ بدر کے بعد نازل ہوئی۔

مباحث! اس سورۃ میں زمانہ جنگ سے متعلق اور جنگ کے بعد پیدا شدہ صورت حال کیلئے ہدایات مذکور ہیں اور انداز خالصتاً مربیانہ ہے۔مثلاً

1۔ جنگ کے بعد جو مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگتا ہے، وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی ملکیت ہے اور انہی کے حکم کے مطابق اس کی تقسیم ہوگی۔اس میں سے جو حصہ تمہیں مل جائے۔ اسے اللہ کا انعام سمجھ کر قبول کرلو۔

2۔مجاہدین سے میدان جہاد میں جو کمزوریاں اور خامیاں ظاہر ہوئیں، ان کی نشاندہی کر کے ان کے ازالے اور اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کیلئے حکم دیا گیا۔

3۔مجاہدین کو یہ باور کرایا گیا کہ ساز و سامان کے بغیر اور مختصری جماعت کے ساتھ اس قدر بڑے اور مسلح دشمن کے مقابلے میں فتح تمہاری محنت کا ثمر نہیں بلکہ اس میں تائید و نصرتِ الٰہی کار فرما تھی۔اس لئے آئندہ بھی اللہ پر بھروسے اور اس کے رسول کی اطاعت ہی ذریعہ نجات و فلاح سمجھیں۔جس مشن اور اخلاقِ حسنہ کی وجہ سے آج تمہیں کامیابی ملی ہے، اسی کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیں۔

4۔قیدی بننے والے مشرکین مکہ اور منافقین کو عبرت آموز خطاب کیا گیا۔اور مسلمانوں کو اصولِ جنگ و صلح کی تلقین کی گئی اور ہدایت کی گئی کہ امن اور جنگ ہر صورت میں دورِ جاہلیت کے طریقوں اور رسموں سے مکمل اجتناب کریں۔تا کہ معاصر اقوام پر تمہارے اخلاق حسنہ کی وجہ سے تمہارے مذہب اور مشن کی حقانیت واضح ہو سکے اور تم مسلمان اس اسلام کی عملی تعبیر و تشریح

کے طور پر خود کو پیش کر سکو۔

5۔ اسلامی مملکت کے اساسی دستور کیلئے بعض بنیادی دفعات (جو دور جنگ کے ساتھ متعلق ہیں) کا ذکر کیا گیا۔ اسی طرح جو لوگ **دارالکفر** میں قیام پذیر ہیں، ان کی قانونی حیثیت بھی متعین کر دی گئی۔

سورۃ الانفال کے زمانہ نزول اور مباحث کے اجمالی تذکرے کے بعد اس سورۃ کے تفصیلی مطالعے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے حالات اور پس منظر کو بھی قدرے اجمال کے ساتھ بیان کر دیا جائے تا کہ دور حاضر کے مسلمان اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ قرون اولیٰ کے مسلمان کن حالات اور مشکلات سے دوچار رہے۔

ہجرت سے قبل مسلمانوں نے مکہ مکرمہ میں مصائب وآلام کا سامنا جس پامردی اور استقامت کے ساتھ کیا، اس نے تاریخ کے دھارے کو موڑنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ مسلمانوں کا صبر وثبات ہی تھا، جس نے اس دور کے دشمن کو یہ بات باور کرائی کہ یہ دعوت ایک دن اپنی منزل تک پہنچ کر رہے گی کیونکہ داعی اور اس کی جماعت کے عزم وارادہ میں کوئی سی چیز بھی رکاوٹ نہیں بن سکی اور نہ ان کے ارادوں میں کسی قسم کا تزلزل پیدا ہوا ہے۔ مکہ والے جواب تک جاہلیت کی رسوم ورواج کو حرزِ جان بنائے ہوئے تھے، دس بارہ برس کے بعد یہ بات سنجیدگی سے محسوس کر رہے تھے کہ مسلمان ان کے پرانے نظام کیلئے شدید خطرہ ہیں کیونکہ مسلمان اخلاص کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب پر مر مٹنے اور جان نثار کرنے کیلئے ہمہ وقت تیار تھے۔ قرابت ورشتہ، مال وزر اور وطن ایسی کوئی بھی چیز ان کو اپنے مذہب کے ساتھ وابستگی اور عشق سے باز نہ کر سکی۔ بلکہ اب مسلمانوں کی آواز مکہ سے باہر اقصائے عالم میں گونج رہی تھی۔ مکی دور کے آخری برسوں میں یثرب کے لوگ اس دین فطرت کی آواز کو سن کر اس پر لبیک کہتے ہوئے حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے اس دین فطرت کو قبول کر لیا اور نبی کریم ﷺ کو دعوت

دی کہ آپ خود اپنے جاں نثاروں سمیت ہمارے شہر کو یہ شرف بخشیں کہ اس کو دارالاسلام قرار دیا جاسکے اور اسلام جس کو اپنی انقلابی دعوت کیلئے تا حال کوئی مرکز نہیں مل سکا تھا وہ یثرب کو دارالاسلام بنا کر ساری دنیا کو دعوت دینے کیلئے وہاں اپنی مرکزیت قائم کرے۔ نبی اکرم ﷺ نے اس دعوت کو قبول کر کے یثرب کو مدِینةُ النّبِیُ یا مدینہ منورہ کے لقب سے ملقب کرایا۔

اس مقام پر ایک دلچسپ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب یثربی لوگ نبی کریم ﷺ کو مدینہ آمد کیلئے دعوت دے رہے تھے عین اس وقت اس وفد میں شریک ایک نوجوان اسعد بن زرارہؓ اور ایک دوسرے صحابی عباسؓ بن عبادہ نے اہل یثرب کو خطاب کیا جس کا خلاصہ یہ تھا:

''اے اہل یثرب! تم اس وقت جس چیز پر بیعت کر کے پیغمبر اسلام کو اپنے شہر میں آمد کی دعوت دے رہے ہو، کیا تم اس کے انجام سے آگاہ ہو؟ یاد رکھو! اس دعوت کا ظاہر مقصد یہ ہے کہ تم اپنے آپ، اپنے مال و زر اور اشراف کی جانوں کو خطرے میں ڈال دو اور سارے عرب کی دشمنی مول لے لو۔ اگر تم یہ سب کچھ برداشت کرنے کی سکت اپنے آپ میں پاتے ہو تو بہتر، وگرنہ آج ہی اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤ اور اس شخص کو فریب نہ دو اور اگر تمہیں یہ سب کچھ گنوا کر آخرت کی بھلائی مقصود ہے تو کھلی آنکھوں اور سنتے کانوں سے لبیک کہو۔'' اس پر وفد کے شرکاء نے اپنے عزائم کا اظہار یوں کیا:

''ہم مال کی تباہی اور اشراف کی ہلاکت کے خطرے کے باوجود اس شخص کو لینے کیلئے تیار ہیں''۔

ادھر یہ سلسلہ جاری تھا، اُدھر اہل مکہ کے جاسوسوں نے یہ حالات اہل مکہ کو جا کر بتائے تو اُنہوں نے اہل یثرب کو نبی اکرم ﷺ کا ساتھ دینے سے باز رکھنے کو پوری کوشش کی۔ جب وہ اس سے عاجز آ گئے اور حالات کا دوسرا رُخ ان کے سامنے آ گیا تو اُنہوں نے دوسرے

اقدامات پرغور وفکر شروع کر دیا کیونکہ یثرب میں مسلمانوں کی طاقت مجتمع اور منظم ہونے کی صورت میں مکہ والوں کو یمن کے راستے ہونے والی تجارت سے ہاتھ دھونے پڑتے اور ان کو سالانہ لاکھوں دینار کا خسارہ ہوتا۔

کفارِ قریش نے اب فوری طور پر مشورہ کیلئے روسائے مکہ کا ایک اجلاس منعقد کیا، جس میں یہ طے کیا کہ نبی ہاشم کے علاوہ قریش کے ہر قبیلے کا ایک ایک فرد جمع کر لیا جائے جو یکبارگی حملہ کر کے محمد (ﷺ) کو قتل کر ڈالیں۔ اس اجتماعی بلوے کے بعد بنو ہاشم، قریش کے سارے قبائل سے لڑ نہ سکیں گے اور قصاص پر رضامند ہو جائیں گے۔ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ہجرت کے ذریعہ مکہ والوں کی سازش سے محفوظ بنا دیا تو کفارِ مکہ اپنی ناکامی پر سٹپٹا اُٹھے۔ اپنی خفت اور ندامت مٹانے کیلئے انہوں نے یثرب کے سردار عبداللہ بن ابیؒ سے رابطہ کیا اور یہ پیغام دیا۔

"تم نے ہمارے جس آدمی (محمدؐ) کو اپنے ہاں پناہ دی ہے، اس کو تم اپنے شہر سے نکال دو وگرنہ ہم حملہ کر کے تمہارے مردوں کو قتل کر دیں گے اور تمہاری عورتوں کو باندیاں بنا لیں گے"۔

یہ وہی دور ہے جب عبداللہ بن اُبیّ مدینے کا بادشاہ بننے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے حکیمانہ تدبیر کی اور یوں یہ فتنہ وقتی طور پر ٹل گیا۔ مگر قریش باز نہ آئے، انہوں نے حج پر جانے والوں کو دھمکیاں دیں اور دھمکی آمیز پیغام بھی بھجوائے اور کہا کہ "ہم تمہیں حج سے روک دیں گے"۔

سعد بن معاذؓ نے ایسی ہی ایک دھمکی کے جواب میں ابوجہل سے کہا کہ "اگر تم نے ایسی کوئی کوشش کی تو ہم تمہیں ایسی راہ گزر سے روکیں گے جس کا نقصان تم اس سے زیادہ محسوس کرو گے"۔ دراصل یہ اشارہ شامی تجارت کا راستہ بند کرنے کی طرف تھا۔ نبی اکرم ﷺ کو جب ان سازشوں کا علم ہوا تو آپ نے اس فتنے کے استحصال کیلئے چند اقدامات کیئے:۔

الف۔ بحرِ احمر کے ساحلی علاقوں میں بسنے والے قبائل کے ساتھ آپ نے گفت وشنید کی اور

اُن سے حلیفانہ معاہدے شروع کر دیئے جس کے نتیجے میں قبیلہ بہینہ سے پہلا معاہدہ ہوا اور اس میں یہ طے پا گیا کہ جنگ کی صورت میں یہ قبیلہ غیر جانبدار رہے گا۔ اسی طرح ینبوع اور ذوالعشیرہ سے متصل بسنے والے قبائل بنی حمزہ سے بھی معاہدہ ہوا جس کی رو سے یہ لوگ دفاع کیلئے مسلمانوں کے حلف بن گئے۔ اسی طرح بنی حمزہ کا حلیف قبیلہ بنی مدلج بھی اس معاہدہ میں شریک ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی تبلیغ نے دیگر قبائل کو بھی متاثر کیا۔

ب۔ قریشی سازشوں کے استحصال کیلئے آپ نے دوسرا اقدام یہ تجویز کیا کہ قریش کے تجارتی قافلوں کو دھمکانے کیلئے چھوٹے چھوٹے دستے وقتاً فوقتاً روانہ کئے۔ مغازی کی کتابوں میں سریہ حمزہؓ، سریہ عبیدہؓ بن حارث اور سریہ سعدؓ بن ابی وقاصؓ کا تذکرہ اسی دور میں ملتا ہے۔

(نوٹ:۔ سریہ اس مہم کو کہتے ہیں جو کسی صحابی کی سرکردگی میں روانہ کی گئی ہو۔)

ان تمام مہمات کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان میں سے کسی مہم میں بھی مدینہ منورہ کے کسی فرد کو شریک نہ کیا گیا۔ جوابی طور پر اہلِ مکہ نے بھی غارت گری کا سلسلہ شروع کر دیا اور اُن کے اسی قسم کے ایک دستے نے کرز بن جابر کی سرکردگی میں مدینہ کے قریب چرنے والے مویشیوں کو لوٹا۔ اہل مکہ نے مسلمانوں کو ملیا میٹ کرنے کیلئے تیاریاں تیز تر کر دیں۔ اس سلسلے کا ایک تجارتی قافلہ سن 2 ہجری میں شام سے لوٹ رہا تھا جس میں ہزاروں اشرفی مالیت کا سامان تھا۔ ابوسفیان نے خطرے کی بو پا کر ایک تیز رفتار سوار کو مکہ سے مدد کیلئے روانہ کر دیا۔ اس نے حسب دستور اونٹ کے کان کاٹے۔ اس کی ناک چیر دی، کجاوہ الٹا اور اپنا لباس تار تار کر کے شور مچا دیا کہ "قریشیو! تمہارے تجارتی مال کو (جو ابوسفیان لے کر آ رہا ہے) محمد ﷺ کے ساتھی لوٹنے کے درپے ہیں"۔ اس خبر پر مکہ کے ایک ہزار جوان کیل کانٹے سے لیس ہو کر مقابلے کیلئے تیار ہو گئے، ان میں 600 زرہ پوش اور سو شہسوار بھی تھے یوں یہ قافلہ سامانِ حرب سے لیس ہو کر اپنے تجارتی قافلے کو بچانے نکلا۔

نبی اکرم ﷺ کو مکہ والوں کی روانگی کی اطلاع مل چکی تھی ۔آپؐ نے حالات کا جائزہ لے کر مجاہدین کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا کہ ایک جانب ابوسفیان کا تجارتی قافلہ ہے اور دوسری جانب مکہ والوں کا لشکرِ جرار ۔عام رائے یہ تھی کہ ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کو روکا جائے مگر حالات کے پیشِ نظر کفارِ مکہ کا مقابلہ ناگزیر تھا۔ کیونکہ مسلمان اگر اس وقت کفارِ مکہ کا ڈٹ کر مقابلہ نہ کرتے اور دبک کر بیٹھ جاتے تو پھر پورے عرب میں مسلمانوں کو پناہ نہ مل سکتی اور مدینہ میں بسنے والے یہودی اور منافق بھی پر پرزے نکال کر مسلمانوں کیلئے مشکلات پیدا کرسکتے تھے۔

نبی اکرم ﷺ نے کفارِ مکہ کے ساتھ مقابلہ سے قبل مسلمانوں کی رائے معلوم کرنا ضروری سمجھی۔مقدادؓ بن عمرو نے عرض کیا کہ ''ہم بنی اسرائیل کی طرح آپ کو اس میدان میں تنہا چھوڑنے والے نہیں''۔اس پر نبی اکرم ﷺ نے اپنے سوال کو پھر دہرایا تو انصار میں سے سعدؓ بن معاذ نے عرض کیا کہ ''اگر آپ کا روئے سخن ہماری جانب ہے تو اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے کہ ہم میں سے ایک بھی اس موقع پر پیچھے نہ ہٹے گا اور ہم یہ ہرگز گوارا نہ کریں گے کہ آپ کل جا کر ہمارے بغیر دشمن کا مقابلہ کریں ۔اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سے وہ سب کچھ دکھا دے گا جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں''۔اس کے بعد کفارِ مکہ کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔تین سو سے کچھ زائد افراد اللہ کے بھروسے پر روانہ ہو گئے جن میں 86 مہاجرین اور باقی انصاری مجاہد تھے۔ایک سو ستر اونٹ اور 60 زرہیں تھیں ۔سامانِ جنگ نہ ہونے کے برابر تھا۔ان حالات میں اس مہم کیلئے جانا سرفروشی کی اعلیٰ ترین مثال اور ایمان کا کامل ترین درجہ ہی ہو سکتا ہے۔

17 رمضان المبارک کو مقامِ بدر پر مقابلہ ہو۔نبی اکرم ﷺ نے اس موقع پر اللہ کے حضور اپنے ہاتھ پھیلا کر دُعا کی جسکے آخری الفاظ یوں تھے:''اے اللہ! اگر آج یہ چند افراد پر مشتمل مسلمانوں کی جماعت ہلاک ہو گئی تو پھر تیرے عبادت گزار نہ رہیں گے''۔مہاجرین کیلئے یہ

آزمائش کی گھڑی بڑی ہی کٹھن تھی کہ آج مقابل فوج میں ان کے اپنے ہی اعزاء واقارب موجود تھے۔کہیں باپ کے مقابل بیٹا اور کہیں ماموں کے مقابل بھانجا تھا۔اس موقع پر مہاجرین نے یہ بات ثابت کردی کہ اُنہوں نے حق سے رشتہ پوری سنجیدگی اور اخلاص کے ساتھ جوڑا ہے۔اس کے مقابل باطل کے سارے تعلقات اور رشتے قطع کرڈالے ہیں۔

تفسیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یسئلونك عن الانفال ۔قل الانفال للّٰه والرسول ۔ فاتقوا اللّٰه واصلحواذات بینکم واطیعوا اللّٰه و رسوله ان کنتم مومنینo

''(اے محمد ﷺ ! مجاہد)لوگ آپؐ سے غنیمت کے مال کے بارے میں دریافت کرتے ہیں(کہ کیا حکم ہے) کہہ دیں کہ غنیمت اللہ اوراس کے رسول کا مال ہے۔اللہ سے ڈرواور آپس میں صلح رکھواور اگرایمان رکھتے ہوتو اللہ اوراس کے رسول کے حکم پر چلو''۔ (الانفال:1)

غنیمت اور فئے

انفال کا لفظی معنی غنیمت ہے۔یہاں ایک اصولی بات پیش خدمت ہے جو یہ ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کا مال دو طرح سے لے سکتے ہیں۔ایک یہ کہ دورانِ جنگ میں مالِ غنیمت کی شکل میں ملنے والا مال ۔اس کے مسائل اسی سورۃ(الانفال) میں بیان ہوئے ہیں۔اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ بغیر جنگ کے غیر مسلمین کے اموال،املاک اوراوقاف مسلمانوں کے ہاتھ آجائیں مثلاً غیر مسلم علاقہ چھوڑکر چلے جائیں اوراُن کی جائیدادیں مسلمانوں کے قبضے میں آجائیں۔جیسا کہ مدینہ منورہ میں یہودی قبائل بنونضیر،بنوقینقاع اور بنوقریظہ وغیرہ کے لوگ مدینہ چھوڑکر چلے گئے تھے اور خیبر میں جاکرآباد ہوگئے۔اب ان کی جتنی بھی املاک تھیں،وہ ساری کی ساری مسلمانوں کے پاس آگئیں۔ان کو اموالِ فئے کہا جاتا ہے۔اس کی وضاحت سورۂ الحشر میں بیان کی گئی

ہے۔اموالِ فئے مسلمانوں کا اور اسلامی ریاست کا حق ہے۔اگر غیر مسلم اس کو چھوڑ کر چلے جائیں تو اس پر ان کا کوئی حق نہیں رہتا۔

مالِ غنیمت کی تقسیم کا طریقہ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

واعلموا انما غنمتم من شیءٍ فان لِلّٰہ خمسہ وللرسول ولذی القربی والیتمٰی والمسکین وابن السبیلo (الانفال۔41)

''اور جان لو! کہ جو چیز تم (کفار سے) غنیمت کی صورت میں لاؤ، اس میں سے پانچواں حصہ اللہ کا، اُس کے رسول کا، اہلِ قرابت، یتیموں محتاجوں اور مسافروں کا ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ بطور اموالِ غنیمت جو کچھ تمہیں عطا کرے، وہ اللہ، اُس کے رسول اور اُن کے قریبی رشتہ داروں کا حق ہے۔نیز عام مسلمانوں اور مسافروں کا حق ہے اور اس میں اسلامی حکومت جس طرح چاہے، تصرف کر سکتی ہے۔بہر حال یہ غیر مسلموں کا حق نہیں بنتا۔اس سورہ مبارکہ میں انفال اور غنائم کا ذکر ہے۔اس کے بعد ذکر و تلاوت کا موضوع شروع ہوتا ہے۔

کامل مومن کی نشانیاں

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

انما المومنون الذین اذا ذکر اللّٰہ وجلت قلوبھم واذا تلیت علیھم ایتہ زادتھم ایمانًا وعلی ربھم یتوکلون o الذین یقیمون الصلٰوۃَ ومما رزقنھم ینفقونo اُولٰٓئِکَ ھم المومنون حقاً ط

''سچے اہلِ ایمان وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز اُٹھتے ہیں اور جب اللہ کی آیات اُن کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ کرتی ہیں اور وہ اپنے رب پر اعتقاد رکھتے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے، اس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں''۔ (الانفال۔4:2)

ایمان کی ایک علامت یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر ان کے سامنے کیا جائے تو ان کے دل وہل جائیں اور دوسرا یہ کہ وہ آہستہ آہستہ اور بتدریج قرآنِ مجید سے ایمان حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔ جونہی ان کے سامنے قرآنِ مجید کی آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ غور سے سنتے ہیں یا وہ خود تلاوت کرتے ہیں تو ہر ہر آیت ان کے ایمان میں اضافہ کرتی چلی جاتی ہے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآنِ مجید کو سمجھے بغیر ایمان حاصل نہیں ہوتا اور نہ ہی کامل ہوتا ہے۔

اس سورۃ میں چونکہ غزوہ بدر سے متعلق احکام کا ذکر ہے تو اس کی تمہید کے طور پر اس کیفیت کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو میدانِ بدر کی جانب کوچ کا حکم دیا جہاں کفارِ مکہ سے مقابلہ تھا تو بعض صحابہؓ کی رائے اس موقع پر یہ تھی کہ یوں بے سروسامانی کے عالم میں بھڑ جانا ہمارے لئے سودمند نہ رہے گا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ان سے مقابلہ کی حکمت و فلسفہ کو یوں فرمایا کہ:۔

واذ یعدکم اللہ احدی الطا ئِفتین انھا لکم و تودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم و یرید اللہ ان یحق الحق بکلمۃ ویقطع دابر الکفرینo لیحق الحق و یبطل الباطل ولو کرہ المجرمونo

''اور جب اللہ نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ (ابوسفیان اور ابوجہل کے) دو گروہوں میں سے ایک گروہ تمہارے لئے (مسخر) ہو جائے گا اور تم چاہتے تھے کہ جو قافلہ بے شان وشوکت (یعنی بے ہتھیار) ہے وہ تمہارے ہاتھ آ جائے اور اللہ چاہتا تھا کہ اپنے حکم سے حق کو قائم رکھے اور کافروں کی جڑ کاٹ کر پھینک دے تا کہ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کر دے۔ گو مشرک ناخوش ہی ہوں۔'' (الانفال:7۔8)

توکل کی حقیقت

گو یہ غزوۂ بدر کے حالات کی تفصیل کا موقع نہیں لیکن ایک بات کا ذکر ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی بے سروسامانی اور مدِ مقابل کی طاقت ہر لحاظ سے تین گنا تھی۔ اگر اللہ کے رسول ﷺ صرف دعاؤں پر ہی گزارا کرتے تو مدینہ منورہ میں بیٹھ کر بھی دُعا مانگی جا سکتی تھی کہ اے

اللہ! قریش کے لشکر کو راستے ہی میں موت سے ہمکنار کردے۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی یہ سنت نہیں۔ جو کچھ بھی ان کے پاس تھا، خواہ وہ افرادی قوت تھی یا حربی قوت، سب کو میدانِ بدر میں صف آرا کر دیا گیا اور جو کچھ حاصل کیا جا سکتا تھا، حضور ﷺ کر گزرے اور انتظام و اہتمام کرنے کے بعد خدا کے حضور دُعا کیلئے ہاتھ اُٹھا دیئے اور نہ صرف یہ کہ دُعا مانگی بلکہ مٹھی بھر کنکریاں بھی کفار کی طرف پھینکیں اور غصے میں فرمایا کہ ''ان کے چہرے بگڑ جائیں'' اس ساری تگ و دو اور بھاگ دوڑ کو دیکھ کر رحمتِ باری نے یوں خطاب فرمایا اور بشارت سنائی:۔

اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم انی ممدکم بالف من الملٰئکۃ مردفینo

''جب تم اپنے رب سے فریاد کرتے تھے تو اس نے تمہاری دُعا قبول کر لی (اور فرمایا) کہ (تسلی رکھو) ہم ہزار فرشتوں سے جو ایک دوسرے کے پیچھے آتے جائیں گے، تمہاری مدد کریں گے''۔ (الانفال:9)

اور مزید آگے اس کی صراحت بھی کر دی کہ یہ سب کچھ تمہارے اطمینان و تسلی کیلئے کیا گیا ہے۔ اس میں ظاہری سبب کے طور پر یہ انعام بھی کیا کہ مومنوں کو عین میدانِ جنگ میں ایک لمحہ کیلئے اونگھ آ ئی جس سے ان کے بدن کی تکان اور دماغ سے بوجھ اُتر گیا اور وہ خوب بے جگری سے لڑے یہاں تک کہ یہ معرکہ کفار کی شکست پر ختم ہوا۔ اُن کے بڑے بڑے لیڈروں سمیت ستر افراد قتل ہو گئے اور بڑے بڑے جغادری قید ہو گئے۔ اب موقع تھا کہ بڑے بڑے ترانے اور قصیدے لکھے جاتے لیکن قرآن انہیں کہہ رہا ہے کہ خود فریبی سے بچو۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ

فلم تقتلوھم ولکن اللہ قتلھم وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی۔

''تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا، اور اے نبی! جو تم نے کنکریاں پھینکی تھیں، وہ تم نے نہیں پھینکی تھیں وہ تو اللہ نے پھینکی تھیں''۔ (الانفال:17)

واقعہ سے تو انکار نہیں غزوہ بدر میں لڑنے کو تو مسلمان ہی لڑے تھے اور تلواریں اور نیزے بھی انہوں ہی چلائے تھے لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ کہ بے شک ہاتھ تمہارے ہی حرکت میں تھے لیکن یہ میں لڑ رہا تھا اور وہ کنکریاں، تمہارے ہاتھ سے تمہارے بازو کے ذریعے سے میں نے پھینکی تھیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ ریت اور کنکریوں کو مٹھی میں اللہ نے ایسی تاثیر دی کہ وہ کفار کے لشکروں کی آنکھوں میں جا پڑیں ۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسباب تم اختیار کرتے ہو، لیکن درپردہ ہاتھ اللہ ہی کا ہوتا ہے اور نتیجہ اللہ کی طرف سے برآمد ہو رہا ہوتا ہے، اس لئے کہ:۔

ان القوة لله جميعًا

''ساری کی ساری قوت اللہ کی ہے۔''(البقرہ:165)

فاعلِ حقیقی اللہ ہے

اس فانی دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے، سب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اسباب اختیار کئے جائیں گے لیکن بھروسا اسباب پر نہیں ہوگا۔ بھروسا اسباب پیدا کرنے والے پر ہوگا۔ جس نے نہ صرف اسباب کو پیدا کیا بلکہ ان میں تاثیر بھی رکھی۔ میں پانی پیتا ہوں، پیاس اللہ تبارک وتعالیٰ بجھاتا ہے۔ حقیقت اور نفس الامر یہ نہیں کہ روٹی نے مجھے طاقت دے دی یا سالن سے میرا پیٹ بھرا۔ طاقت تو اللہ ہی دیتا ہے۔ اسی طرح بیماری میں شفا دوا نہیں دیتی، شفا تو اللہ ہی دیتا ہے، جس نے دوا میں تاثیر ڈال دی ہے۔ دوا کے راستے سے اللہ کا ہاتھ ہے جو کام کر رہا ہوتا ہے اور مجھے شفا دے رہا ہوتا ہے۔

والذی هو يطعمنی ويسقين٥ واذا مرضت فهو يشفين٥

''وہی ہے جو مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی ہے جو شفا عطا فرماتا ہے''۔ (الشعراء79۔80)

قند مکرر

روزے روز روز نہیں آتے

(قبلہ محمد صدیق ڈار توحیدی)

جب تک زندگی کا مقصود اور اسلام کی حقیقت معلوم نہ ہو تقویٰ کی اہمیت سمجھ میں آ سکتی ہے نہ ہی رمضان المبارک کی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی محبت اور بندگی کے لئے پیدا فرمایا۔ حیات ارضی کے دوران اس کی حقیقی کامیابی کا دارومدار اس امر پر ہے کہ وہ بھرپور دنیوی زندگی بسر کرتے ہوئے دنیا اور متاع حیات کی محبت میں نہ پھنسے بلکہ سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ سے کرے اور دنیا کے مقابلے میں آخرت کی زندگی کو ترجیح دے۔ دین اسلام کی فرض عبادات کا مقصود اہل ایمان میں یہی جذبہ پیدا کرنا اور اسے ترقی دے کر کمال تک پہنچانا ہے۔ یہی تقویٰ کی حقیقی روح ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے دنیا و مافیہا کی محبت اور نفس کی ہوا و ہوس سے بچتا ہوا اللہ کی محبت کو بڑھاتا چلا جائے اور مرتبہ احسان تک پہنچ کر اس کے مقربین کے زمرہ میں شامل ہو جائے۔ یہ تقویٰ ہی کا کمال ہے جو مومن کو متاع غرور سے بے نیاز کر کے ایمان کی معراج تک پہنچا دیتا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ سب برائیوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے۔ اسی طرح اللہ کی محبت تمام نیکیوں اور خوبیوں کا منبع ہے۔ قرآن کریم میں اہل ایمان کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے شدید محبت کرتے ہیں یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ آخرت ان متقین کے لئے ہے جو دنیا میں ظلم و ستم اور جبر کے ذریعے بڑائی کے خواہاں نہیں ہوتے بلکہ اس کے عاجز بندے اور اس کی مخلوق کے بے لوث خادم بن کر زندہ رہتے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ آخرت کی کامیابی متقین کی ہے اور اپنے پروردگار کی مغفرت اور جنت کی طرف دوڑو جو متقین کے لئے تیار کی گئی ہے اور اللہ متقین سے محبت کرتا ہے۔ اہل تقویٰ کی شان کے برعکس یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے وہ لوگ ہونگے

جنہوں نے اپنی صلاحیتیں صرف دنیا کے حصول میں صرف کرڈالیں یعنی تقویٰ کی راہ اختیار ہی نہ کی۔اہل ایمان کو بھی یہ حکم دیا گیا کہ مال واولاد کی محبت تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کردے۔ جوبھی ایسا کریں گے وہ خسارہ پانے والوں میں سے ہوجائیں گے۔

قرآن کریم کے شروع میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اس کتاب سے رہنمائی اور ہدایت انہی لوگوں کوعطا ہوگی جوتقویٰ والی زندگی بسر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی رضا اوراس کے قرب کے حصول کے خواہاں ہوں گے۔اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تمام نعمتیں انسان کیلئے ہی پیدا فرمائی ہیں تاکہ وہ انہیں کام میں لائے اوراپنے رب کے احسانات تسلیم کرکے اس کی شکرگزاری کا رویہ اپنائے اوراس کی محبت کی راہ میں برابر آگے بڑھتا چلا جائے۔تقویٰ کا تقاضا بس یہ ہے کہ دنیا کے مال و متاع کی محبت میں پھنس کراللہ کو نہ بھولے۔حضرت عمرؓ کے پوچھنے پرایک صحابی نےتقویٰ کی صفت کے اظہار کیلئے ایک نہایت بلیغ مثال بیان فرمائی۔آپ نے فرمایا کہ جس طرح خاردار جھاڑیوں کے درمیان واقع کسی راستہ پر چلتے ہوئے انسان اپنی چادر کوسمیٹ کر چلتا ہے کہ مبادا کانٹوں میں اُلجھ جانے سے بھی پھٹ جائے اور وقت بھی ضائع ہو۔یہی تقویٰ کی مثال ہے۔یوں سمجھ لیں کہ انسان نے اللہ تعالیٰ کی محبت کی خلعت اوڑھ کرایک بھاری امانت قبول کرلی جس کے اُٹھانے سے زمین،آسمان اور پہاڑ عاجز آگئے تھے۔اب کامیاب انسان وہی ٹھہرے گا جواس خارزار حیات میں اللہ کی محبت کی چادر کوصحیح وسالم اور بے داغ لے کرگذر جائے۔یہ کٹھن منزل صرف تقویٰ کے بل بوتے پر ہی طے کی جاسکتی ہے۔اب آپ غور فرمائیں کہ رمضان المبارک کے روزوں کی غرض وغایت ہی یہ بتائی گئی ہے کہ اس سےتقویٰ پیدا ہوتا ہے۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے اہل ایمان گذشتہ اُمتوں کی طرح تم پربھی روزے لکھ دئے گئے ہیں تاکہ تم تقویٰ حاصل کرسکو۔اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ تقویٰ کے حصول کیلئے روزہ ہی بہترین، لازمی اور یقینی ذریعہ ہےاوراسی وجہ سے ہر دور کے انسانوں کی تربیت کیلئے اسے فرض قرار دیا گیا۔

تقویٰ کے دو جزو ہیں پہلا ماسواء اللہ کے کانٹوں سے اپنا دامن بچانا اور دوسرا اللہ تعالیٰ کی محبت کی راہ میں آگے بڑھتے چلے جانا ہے۔تقویٰ کی تقویت کیلئے سالانہ روزوں کے تربیتی کورس میں ان دونوں پہلوؤں کو پوری اہمیت دی گئی ہے۔ایک طرف پورا دن بھوکا پیاسا رکھنے کا اہتمام ہے تا کہ اہل ایمان کھانے، پینے اور جنسی جبلتوں کو ترک کر کے یہ ثابت کر دیں کہ ہم اپنے محبوب حقیقی کی رضا کیلئے سب کچھ قربان کر سکتے ہیں۔ان حلال چیزوں سے اپنے نفس کو روکنے کی مشق سے غرض و غایت یہ ہے کہ تقویٰ کا وہ ملکہ حاصل کیا جائے جس کی مدد سے ہر اس چیز سے بچا جا سکے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو۔حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جسم کے تمام اعضاء کا روزہ ہے اور جس نے جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا اللہ تعالیٰ کو اس کے بھوکا پیاسا رہنے سے کوئی غرض نہیں۔آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جنہیں بھوک اور پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔گویا ماکولات و مشروبات سے رُکنے کی مشق کا اصل مقصد اپنے سرکش نفس کو لگام ڈالنا اور منکرات سے باز رہنا ہے۔یہی امر صوم یعنی روزے کی بنیادی حقیقت ہے کیونکہ صوم کے لفظی معنی کسی چیز سے باز رہنا ہے۔یہی امر صوم یعنی روزے کی بنیادی حقیقت ہے کیونکہ صوم کے لفظی معنی کسی چیز سے باز رہنا یا رُک جانا ہے۔دوسری عبادات میں کچھ کام کرنے کے ہوتے ہیں لیکن روزے میں ان کے برعکس اپنے آپ کو چند کاموں سے روک کر رکھنا ہوتا ہے۔یہ سیلف کنٹرول یعنی ضبط نفس کی تربیت کا انتظام کیا گیا ہے۔

ماہ رمضان کے روزوں کے اس پہلو کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت کو فروغ دینے اور اس کا قرب حاصل کرنے کیلئے نماز تراویح، نوافل، مالی صدقات اور قرآن کریم کی کثرت کے ساتھ تلاوت کا حکم دیا گیا ہے۔سحری کے وقت بیدار ہو کر نماز تہجد کی خصوصی برکات حاصل کرنے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ماہ رمضان کے آخری عشرہ میں تمام دنیوی سرگرمیاں قطع کر کے اللہ کے گھروں میں معتکف ہو جانے کی بھی ترغیب دی گئی ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی رحمت

سمیٹ لی جائے ۔ دین اسلام کے اس سالانہ روحانی تربیتی نظام سے اگر کماحقہ استفادہ کیا جائے تو دوسرے کسی چلے اور مجاہدے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی ۔

ماہ رمضان کے روزوں کے اس پہلو کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت کو فروغ دینے اور اس کا قرب حاصل کرنے کیلئے نماز تراویح، نوافل، مالی صدقات اور قرآن کریم کی کثرت کے ساتھ تلاوت کا حکم دیا گیا ہے ۔ سحری کے وقت بیدار ہو کر نماز تہجد کی خصوصی برکات حاصل کرنے کا موقع بھی مل جاتا ہے ۔ ماہ رمضان کے آخری عشرہ میں تمام دنیوی سرگرمیاں قطع کر کے اللہ کے گھروں میں معتکف ہو جانے کی بھی ترغیب دی گئی ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سمیٹ لی جائے ۔ دین اسلام کے اس سالانہ روحانی تربیتی نظام سے اگر کماحقہ استفادہ کیا جائے تو دوسرے کسی چلے اور مجاہدے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی ۔

قرآن کریم کے نزول والے مہینہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہمیشہ کیلئے خصوصی برکتوں اور رحمتوں کے نزول کا مہینہ بنا دیا ہے ۔ اس ماہ کی نفلی عبادت سے فرضوں کی ادائیگی کا ثواب ملتا ہے اور فرائض کا اجر ستر گنا بڑھا دیا جاتا ہے ۔ اس کا ظاہری ثبوت تو اس ماہ مبارک میں اہل ایمان کی جوش و خروش کے ساتھ صوم و صلوٰۃ کی پابندی ہے ۔ ہمیں چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت سے ملی ہوئی اس روحانی سہولت سے حقیقی فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی کوتاہیاں اور خامیاں دور کر لیں تا کہ اللہ کا مزید قرب حاصل کر سکیں ۔ اگر ہم سچے دل سے سدھرنے کا ارادہ کر لیں تو اس ماہ کی برکت سے باہر سے کوئی شیطانی طاقت ہماری راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالے گی ۔ لیکن اگر ہمارا اپنا ارادہ ہی یہ ہو کہ ایک ماہ کی بھوک پیاس کی مشقت کے بعد عید کے روز اپنی گذشتہ روش کی طرف لوٹ جانا ہے پھر تو معاملہ کی نوعیت ہی مختلف ہو گئی ۔ اللہ تعالیٰ انہی کی مدد فرماتے ہیں جو اپنی مدد آپ کرنے کی ہمت کرتے ہیں ۔ وہ ہماری حالت کو صرف اسی صورت میں بدلتے ہیں جب ہم خود اپنے نفسوں کو بدلنے کیلئے کمر بستہ ہو جائیں ۔

اگر ہمیں اللہ کی محبت کی فکر ہو، میدان حشر میں اس کے سامنے پیشی کی فکر ہو، اسکی رضا و رحمت اور جنت کی سچی طلب ہو تو سب مہینوں کا یہ سردار مہینہ اللہ تعالیٰ کی ایک بیش بہا نعمت ہے۔ جو رحمتیں رمضان شریف میں نازل ہوتی ہیں وہ دوسرے مہینوں میں بھلا کہاں نصیب ہو سکتی ہیں۔ رمضان المبارک کے روزوں کی برکتوں کا مقابلہ پورے سال کے روزے بھی نہیں کر سکتے۔ ایسے روزے روز روز نہیں آتے یہ مہینہ اللہ تعالیٰ سے اس کی مغفرت طلب کرنے اور عفوو درگذر کے لئے التجائیں لینے کا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ پوری ہمت صرف کر دیں۔ قلت طعام و منام کی مشق کے ساتھ ساتھ کثرت ذکر، کثرت تلاوت قرآن، کثرت درود شریف، کثرت صدقات اور سرکشی کی روش ترک کر دے اور ہمارے اندر صراط مستقیم پر چلنے، اخلاق کا تزکیہ کرنے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا جذبہ اس قدر قوی اور بلند ہو جائے کہ سال بھر کیلئے کافی ہو جائے۔ ہر کورس اور تربیتی مشق کا اصل ہدف انسانوں کی سوچ اور ان کے کردار میں تبدیلی لانا ہوتا ہے۔ ہمیں بھی چاہیے کہ ہم عید کے دن اپنے قلب و نفس کا جائزہ لیں کہ کیا واقعی ہمارے اندر تقویٰ کی مطلوبہ قوت پیدا ہوگئی ہے۔ اگر جواب اثبات میں ہو تو اس بات پر اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے کیونکہ مہینہ بھر کی محنت کا یہ ثمر اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام ہے۔ یہی اصل عید اور عید کا حقیقی پیغام ہے کہ ماہ شوال کا چاند ہمیں ایک بدلا ہوا انسان پائے۔

دُعائے مغفرت

گوجرانوالہ کے چوہدری محمد حسین (مارشل) کے بڑے بھائی۔

پنڈی کے مولوی نذیر توحیدی کے جواں سال بیٹے۔

اور محمد رمضان کی والدہ صاحبہ رضائے الٰہی سے انتقال کر گئے ہیں۔

تمام بھائیوں سے دُعائے مغفرت کی اپیل ہے

جنیدؒ کا عقیدہ صحو

(پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ)

جو لوگ مقام توحید پر فائز ہوتے ہیں یعنی خدا کی حضور میں زندگی بسر کرتے ہیں، ان کی اپنی مرضی باقی نہیں رہتی۔ وہ خدا کے ہاتھ میں بمنزلہ آلہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرتے کیونکہ ان کی مرضی حق میں فنا ہو چکی ہوتی ہے۔

اس عقیدے میں ایک خطرہ یہ لاحق ہوتا ہے کہ سالک یہ خیال کر سکتا ہے کہ جب میری کوئی مرضی ہی باقی نہیں رہی تو احکام شرع بھی مجھ سے ساقط ہو گئے۔ میں اوامر و نواہی سے بالاتر ہو گیا ہوں۔ یہ احکام تو دنیا والوں کیلئے ہیں نہ کہ میرے لئے۔ وقس علی ھذا۔ یہ غلط خیال خود جنیدؒ کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک شخص نے اُن سے کہا کہ بعض صوفیہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے برگزیدہ بندوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ عمل سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ جنیدؒ نے جواب دیا کہ ''جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ خطا کار ہیں۔ جو صوفی احکام شرع سے روگردانی کرے وہ سخت گنہگار ہے۔ تصوف تو سراسر اتباع شرع ہے۔ ایک زانی بھی ایسا عقیدہ رکھنے والے سے بہتر ہے۔ اگر میں ایک ہزار برس تک زندہ رہوں تو بھی اتباع احکام الٰہیہ کرتا رہوں گا''۔

جنیدؒ کا یہی قول ان کے اخلاقی نظریہ صحو کی بنیاد ہے، جس طرح توحید ان کے علمی یا فلسفیانہ نظریے کی۔ اور جنیدؒ کا نظام تصوف انہی دو نظریوں پر مبنی ہے۔ چنانچہ ہجویریؒ لکھتے ہیں کہ ''جنیدؒ '' کا نظریہ صحو بہت مشہور و معروف ہے اور تمام شیوخ نے اسے اختیار کیا ہے''۔ جنیدؒ نے اس بات کو وضاحت سے بیان کیا ہے کہ نظریہ فناء سالک کی آخری منزل نہیں ہے۔ اگر سالک جذب و سکر سے مغلوب ہو جائے تو اسے بہت نقصان پہنچ سکتا ہے کیونکہ پھر وہ اُن فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا جو معاشرے کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ''اللہ اپنے بندے سے اس بات کا بھی طالب ہے کہ وہ جس سوسائٹی میں رہتا ہے اس کے حقوق و فرائض پوری توجہ سے ادا کرے۔ جب بندہ فانی فی اللہ ہو کر باقی باللہ کے مقام کو حاصل

کر لیتا ہے تو وہ حالت سکر سے حالت صحو میں واپس آ جاتا ہے اور فناء کے بعد پھر انسانی یا انفرادی صفات اختیار کر لیتا ہے اور چونکہ اس کی شخصیت سے صفات ایزدی کا رنگ جھلکنے لگتا ہے اس لئے وہ دوسرے ہم جنسوں کیلئے اُسوہ (نمونہ) بن جاتا ہے۔یعنی وہ اپنے اعمال سے دوسروں کو یہ سبق دیتا ہے کہ وہ بھی اس کی طرح صحیح معنٰی میں شریعت کا اتباع کریں''۔

پس کوئی شخص صحیح معنی میں شیخ طریقت نہیں بن سکتا جب تک وہ حالت صحو میں واپس آ کر اپنے عمل سے لوگوں کو شریعت کے اتباع کا درس نہ دے۔ایسا شیخ بیک وقت خدا کی معیت (حالت جذب) اور بندوں کی معیت (حالت صحو) میں زندگی بسر کرتا ہے۔وہ اپنی باطنی زندگی میں خدا کے ساتھ رہتا ہے اور ظاہری زندگی میں بندوں کے ساتھ۔وہ کہتے ہیں ''خدا اپنے محبوب بندوں کو پہلے اپنا قرب عطا کرتا ہے، اس حالت میں وہ دنیا والوں سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔پھر خدا انہیں اپنے سے جدا کر دیتا ہے تا کہ وہ دنیا والوں سے رابطہ قائم کر سکیں اور انہیں راہ راست دکھا سکیں۔یعنی ان کی زندگی غیب وحضور دونوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔دنیا سے غائب ہو کر حضور حق میں ہوتے ہیں اور حق سے غائب ہو کر دنیا میں بسر کرتے ہیں''۔

صوفی حالتِ صحو میں اس لئے واپس آتا ہے کہ وہ خدمت خلق کر سکے کیونکہ یہی اس کا وظیفہ حیات ہے۔حضور حق سے واپس آ کر صوفی وہ نعماء انسانوں میں تقسیم کرتا ہے جو اسے حالت سکر میں بارگاہ ایزدی سے ملتی ہیں۔وہ طالبانِ علم کو علوم شرعیہ کا درس دیتا ہے، طالبان حق کو حق سے ملنے کی راہ سمجھاتا ہے حسب توفیق عوام سے ہمدردی کرتا ہے، ان کو راحت پہنچاتا ہے مختصر یہ کہ وہ دوسروں کیلئے جیتا ہے اور اپنی پاکیزہ زندگی سے عوام کے سامنے سچے مومن کا نمونہ پیش کرتا ہے۔

حالت فناء (جذب وسکر) اور حالتِ صحو (ہشیاری یا سلوک) کا یہ امتزاج کوئی آسان بات نہیں ہے۔یہ مقام انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جن پر اللہ تعالیٰ ہر وقت اپنا فضل وکرم نازل کرتا رہتا ہے۔اس حالت میں سالک حقیقی حریت سے بہرہ ور ہو جاتا ہے یعنی نہ اس پر خوف طاری ہوتا ہے نہ حزن۔دنیا کا کوئی حادثہ اس کے اطمینانِ قلب کو زائل نہیں کر سکتا۔اگر اسے قارون کا

خزانہ مل جائے تو خوش نہیں ہوتا اور اگر فاقوں کی نوبت آجائے تو رنجیدہ نہیں ہوتا۔ فقر و غناء دونوں حالتوں میں یکساں رہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر مجھے نعماء دنیوی میسر ہوگئی ہیں تو اللہ کے حکم سے ہوئی ہیں اور اگر چلی گئی ہیں تو اُسی کے حکم سے۔ اگر وہ جلوت میں ہے تو بھی اس کا دل اللہ کی طرف راغب ہے اور اگر خلوت میں ہے تو بھی۔

فانی فی اللہ ہو کر سالک کی جو باطنی کیفیت ہوتی ہے اس کا نقشہ جنیدؒ نے الفاظ میں کھینچا ہے" ایک زمانہ وہ تھا جب باشندگانِ ارض و سما میرے حال پر روتے تھے، پھر وہ زمانہ آیا جب میں اُن کے حال زار پر روتا تھا اور اب یہ حال ہے کہ نہ مجھے اُن کی خبر نہ اپنی"۔

جنیدؒ نے بایزید بسطامیؒ کے مسلک سُکر کے خلاف، مسلک صحو کو بڑی شدومد کے ساتھ اس لئے پیش کیا کہ اول الذکر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سالک کا تعلق عوام سے منقطع ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی راہبانہ ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہجویریؒ نے آخر الذکر مسلک کی تائید کی ہے جسکی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی جب ہم کشف المحجوب کا تذکرہ کریں گے۔

خلاصہ کلام اس کہ جنیدؒ کا یہ مسلک تصوف کی تاریخ میں یکتا ہے۔ انہوں نے مسلک صحو کو سُکر پر ترجیح دے کر اُن مقاصد کا سدِ باب کر دیا جو حالتِ سکر میں مبالغہ کرنے یا اسے ترجیح دینے سے پیدا ہو سکتے تھے اور فی الواقع پیدا ہوئے۔ چنانچہ شروع سے لے کر آج تک عوام الناس مجذوبوں کو سالکوں پر فوقیت دیتے ہیں کیونکہ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ جو مجذوب ہے وہ سچا "اللہ والا" ہے۔ بالفاظ دیگر اہل اللہ میں اس قدر مبالغہ کیا کہ انہوں نے مجنونوں کو بھی مجذوبوں کے زمرے میں شامل کر لیا۔ چنانچہ جب کوئی پاگل انہیں گالیاں دیتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور ان کی عقیدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جنیدؒ نے مسلکِ صحو پر زور دے کر بلا شبہ تصوف کی بہت بڑی خدمت انجام دی۔

معرفتِ باری تعالیٰ:۔

صوفیہ کا عقیدہ ہے کہ خدا کی معرفت بذریعہ عقل حاصل نہیں ہو سکتی۔ عقل تو محسوسات میں

چل سکتی ہے اور خدا وراءالمحسوسات ہے۔ خدا غیر مادی ہی نہیں ہے بلکہ وہ منطق کی گرفت سے بھی باہر ہے۔ علم باری تعالیٰ جسے صوفیہ اپنی اصطلاح میں معرفت کہتے ہیں، اس بات پر موقوف ہے کہ بندہ اللہ کو راضی کرلے تو اللہ تعالیٰ اس پر اپنا فضل کرے گا یعنی اسے وہ باطنی قوت عطافرمائے گا جس کی بدولت اسے مشاہدہ ذات ہو سکے گا۔ مختصر یہ کہ خدا کی معرفت استدلال سے نہیں بلکہ کشف والہام سے حاصل ہو سکتی ہے۔

صوفیہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حصولِ معرفت ہی صوفی کا مقصدِ حیات ہے اور جو شخص معرفت حاصل کرلے اسے عارف کہتے ہیں یعنی اس نے خدا کو پہچان لیا جس طرح وہ اپنے آپ کو پہچانتا ہے۔ معرفت کے بغیر کوئی سالک اللہ سے محبت نہیں کر سکتا کیونکہ محبت کیلئے معرفت شرط اولین ہے، اسی لئے معرفت کا درجہ علم سے برتر ہے۔

بقول قشیریؒ ''جب سالک کو اللہ کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ نفسِ امارہ کی غلامی سے بالکلیہ آزاد ہو جاتا ہے اور یکسوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر سکتا ہے۔

جنیدؒ کا مسلک اس باب میں یہ ہے کہ وہ علم اور معرفت میں کوئی فرق نہیں کرتے لیکن تسلیم کرتے ہیں کہ عوام اور خواص کے علم باری تعالیٰ میں مدارج کا فرق ضرور ہے۔ خدا کے متعلق عوام کا علم ادنیٰ درجے کا ہے، خواص کا علم اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے۔

علماء یہ کہتے ہیں کہ عقل کے ذریعے سے خدا کا علم حاصل ہو سکتا ہے صوفیہ کہتے ہیں کہ وہ علم ناقص ہوتا ہے۔ صحیح علم یعنی معرفت عقل کے ذریعے سے نہیں بلکہ قلب کے ذریعے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یعنی صوفیہ علم اور معرفت میں فرق کرتے ہیں۔ جنیدؒ اس میں اصلاً فرق نہیں کرتے صرف مدارج کا فرق تسلیم کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اولیاء کا علم علماء کے علم سے برتر اور عمیق تر ہوتا ہے مگر کامل علم نہ علماء کو حاصل ہو سکتا ہے نہ اولیاء کو۔ جو لوگ سب سے زیادہ عارف ہیں وہی سب سے زیادہ اپنے قصورِ فہم کے معترف ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ اور بندے میں تباین کی نسبت ہے یعنی اللہ خالق ہے بندہ مخلوق ہے۔ اللہ قدیم ہے، ازلی اور ابدی ہے بندہ حادث، فانی

اور ہالک ہے۔ اللہ حق ہے بندہ محض نمودِ بے بود ہے۔ اللہ قادر مطلق اور عالم الغیب ہے بندہ عاجز اور جاہل ہے۔

ہمارے علم باری کا ابتدائی درجہ یہ ہے کہ ہم اس کی احدیت کا اقرار کریں اور انتہائی درجہ یہ ہے کہ ہمارے اندر تقویٰ اللہ، زہد وورع اور پاکی قلب ونظر پیدا ہو جائے اور ہم ہر شے میں اسی کا وجود دیکھیں۔ اور ہر وقت اُس کی حمد وثناء کرتے رہیں اور اسے اپنی جانوں سے بھی زیادہ محبوب رکھیں"۔

جنیدؒ کی رائے میں خدا کا علم حاصل کرنے کا ذریعہ عقل ہی ہے لیکن عقول میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ اسی لئے جو زیادہ عاقل ہے وہ زیادہ عالم ہے۔ انہوں نے خدا کے متعلق بندوں کے علم کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ پہلا علم استدلال کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، دوسرا وجدان کے وسیلے سے۔ چنانچہ انہوں نے مکتوب نہم میں اس کی صراحت کی ہے۔

خلاصہ کلام اینکہ پہلی منزل میں سالک عقل کے ذریعے سے علم حاصل کرتا ہے اور اعلیٰ سطح پر وجدان سے اس کی تائید مزید ہو جاتی ہے لیکن جب وہ توحید کی منزل میں پہنچتا ہے تو اس کی شخصیت پر فناء طاری ہو جاتی ہے اور اس مقام پر عقل وخرد کا گذر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ''جب سالک بحرِ توحید میں غرق ہو جاتا ہے تو عقل کی روشنی میں اس کی حالت کا بیان نہیں کیا جا سکتا (عقل اس حالت کا ادراک نہیں کر سکتی) بلکہ اس منزل میں موحد، عقل کے ارشادات یا ترغیبات دونوں کو رد کر دیتا ہے۔ عقل بے چاری سالک کی اس نئی زندگی کا ادراک نہیں کر سکتی جو اُسے فنا فی اللہ ہو جانے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ واضح ہو کہ غریقِ بحرِ وحدت ہو کر سالک کی قلبِ ماہیت ہو جاتی ہے۔ (جس طرح آگ میں پڑ کر لوہا بھی آگ ہو جاتا ہے) اور عقل اس حالت منقلبہ کا ادراک نہیں کر سکتی۔ حق یہ ہے کہ جب سالک مقام توحید پر فائز ہوتا ہے تو اس کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے ہاں انفرادیت کے مظاہر خارجی باقی رہتے ہیں یعنی وہ حاضر بھی ہوتا ہے غائب بھی اور عقل کی نگاہ میں یہ حالت محال ہے کیونکہ مستلزم اجتماع ضدین ہے''۔

جنیدؒ کا مسلک یہ ہے کہ جب سالک کو وہ تنویر قلب حاصل ہوجاتی ہے جسے اصطلاح میں توحید کہتے ہیں تو اس مقام پر پہنچ کر

آتا ہے جو بزم رنداں میں تو عقل وخرد کو چھوڑ کے آ
اے عقل وخرد کے دیوانے یاں عقل وخرد کا کام نہیں

(جگر مرادآبادی)

اسے حقیقی معرفت حاصل ہوتی ہے۔اور بات بھی معقول ہے: جب تک سالک کو حضوری حاصل نہ ہو۔وہ موحد نہیں بن سکتا اور حضوری کے لیے مشاہدہ شرط ہے اور جب مشاہدہ کی نعمت حاصل ہوگئی تو اب خدا کی ہستی میں کوئی شک نہ رہا اور یہی معرفت ہے۔

جنیدؒ کہتے ہیں توحید ایزدی کا علم اور چیز ہے اور مقام توحید پر فائز ہونا اور چیز ہے۔یعنی علم توحید، مشاہدۂ توحید سے مغائر ہے۔زبان سے اللہ کو ایک کہنا بہت آسان ہے لیکن اس کی وحدت کا مشاہدہ کرنا بہت مشکل ہے اور اسی لئے ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔اللہ کی معرفت حاصل ہوجانے کے بعد کوئی مسلمان غیر اللہ کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرسکتا۔

جنیدؒ کی اصطلاح میں معرفت آخری منزل نہیں ہے بلکہ توحید کے مقام پر فائز ہوجانا آخری منزل ہے اور یہی مقصود حیات ہے۔اس مقام پر پہنچ کر سالک کو اللہ کا علم ہی حاصل نہیں ہوجاتا بلکہ وہ علم باری سے بھی حصہ وافر حاصل کرلیتا ہے۔اور یہ وہ اعزاز ہے جس کو بذریعہ الفاظ بیان کیا جاسکتا ہے اور نہ عوام اسے سمجھ سکتے ہیں۔جنیدؒ کی رائے میں موحد ہی عارف ہوتا ہے۔

> خدا سے تعلق زبان سے ذکر کرنے کی کثرت پر اس قدر منحصر نہیں ہے جس قدر دل سے اس کو ہر وقت یاد رکھنے اور اخلاق کا تزکیہ کرنے پر منحصر ہے۔
> (چراغ راہ۔183)

نفی کی حقیقت

(ابن طاہر)

یہ جولائی 2003ء کا واقعہ ہے جب پہلی دفعہ میری ملاقات قبلہ بابا جان محمد صدیق ڈار صاحب سے ہوئی۔ پہلی ہی ملاقات میں جب میں نے بیعت کی استدعا کی تو بابا جان کمال شفقت سے فرمانے لگے کہ بھائی ہم ایسے ہی بیعت نہیں کیا کرتے بلکہ آپ پہلے ذکر اذکار کرو اور جب دیکھو کہ ذکر کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں اور روحانی فائدہ حاصل ہو رہا ہے تو بیعت ہو جاؤ وگرنہ نہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے آپ مجھے اذکار تلقین فرمائیں۔ تو آپ فرمانے لگے کہ ہمارے سلسلہ میں دو اذکار مستعمل ہیں ایک تو پاس انفاس کا ذکر ہے اور دوسرا نفی اثبات کا۔ پھر آپ نے مجھے با قاعدہ یہ ذکر سکھایا اور فرمایا کہ یہ ذکر نفی اور اثبات کی پریکٹس کیلئے کروایا جاتا ہے۔ اور جب تک نفی کامل نہ ہو عالم روحانی سے صحیح رابطہ ممکن نہیں ہے۔ یہ سننا تھا کہ میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ میں نفی کو کاملیت تک ضرور پہنچاؤں گا کیونکہ میرے دل میں روحانی عالم کو دیکھنے کا شوق تقریباً بچپن سے مچل رہا تھا۔

خیر میں نے اللہ کا نام لے کر ذکر نفی اثبات کرنا شروع کر دیا۔ شروع میں تو کافی دقت پیش آئی کیونکہ خیالات نفی نہیں ہوتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ کم ہونے شروع ہو گئے۔ اسی اثنا میں میں نے بانی سلسلہ حضرت خواجہ عبد الحکیم انصاریؒ کے مکتوبات کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔ اس میں آپؒ نے نفی کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس میں ایک جگہ آپؒ فرماتے ہیں کہ نفی اثبات کے علاوہ اور اوقات میں بھی نفی کی مشق کرنی چاہیے۔ بالخصوص سونے سے پہلے اپنے دماغ کو ہر طرح کے خیالات سے خالی کر لو۔ یہ پڑھنے کے بعد میں نے اس پر بھی عمل کرنا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ یکسوئی پیدا ہونا شروع ہو گئی اور خیالات کی بھرمار بھی تقریباً ختم ہو گئی۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں جب چاہتا اپنے دماغ کو تمام خیالات سے پاک کر لیتا۔ کافی عرصہ اس حالت میں گزر گیا لیکن روحانی عالم منکشف نہ ہوا۔ میں بڑا حیران تھا کہ نفی تو کامل ہے لیکن روحانی عالم کا

مشاہدہ کیونکر ممکن نہ ہوا۔ میں اس حالت میں مایوس نہ ہوا بلکہ اور لگن اور محنت سے نفی کی مشق کرنا شروع ہوگیا۔ اِسی اثناء میں میں نے محسوس کیا کہ جب میں حالت نفی میں بیٹھتا ہوں تو میرا دماغ بالکل خالی ہوتا ہے اور کوئی خیال اس میں نہیں ہوتا۔ لیکن بیٹھنے کے کچھ عرصہ بعد کوئی نہ کوئی خیال کہیں اور سے میرے دماغ پر وارد ہوتا ہے۔ اس بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اسی دوران میرے تجربے میں ایک بات یہ بھی آئی کہ جو خیالات میرے دماغ پر کہیں اور سے وارد ہوتے ہیں وہ میں نے زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں سوچے تھے۔ اس لئے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انسانی دماغ جو خیال بھی زندگی میں ایک دفعہ سوچتا ہے وہ کہیں محفوظ ہو جاتا ہے اور وہی خیال اُس جگہ سے دماغ پر نازل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ کیسے اور کیوں ہوتا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے مجھے اس بارے میں کوئی علم نہ تھا۔

اِسی دوران کافی عرصہ گزر گیا لیکن کوئی بات بھی میرے پلے نہ پڑی۔ آخر کار ایک دن اللہ رب العزت نے رحم فرمایا اور مجھے انشرح صدر ہوا۔ ہوا یوں کہ میں ایک دن بیٹھا نفی کی مشق کر رہا تھا کہ ایک خیال میرے دماغ پر وارد ہوا۔ میں فوراً خیال کی طرف متوجہ ہوا اور دیکھا کہ یہ کہاں سے آ رہا ہے تو اچانک میرے اوپر ایک اور دماغی حس کا انکشاف ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ جتنے خیال میں نے اپنی زندگی میں کبھی سوچے تھے وہ وہاں پر کسی مہر کی مانند ثبت ہیں اور جو بھی خیال میری پہلی دماغی حس سوچتی ہے وہ یہاں آ کر ثبت ہو جاتا ہے اور وہاں سے دوبارہ نزول بھی کرتا ہے۔ پہلی دماغی حس کو آپ شعور کا نام دے سکتے ہیں اور دوسری دماغی حس کو لاشعور کا۔ اب ہوتا یہ ہے کہ جب سالک نفی کرتا ہے تو اُس کا شعور سو جاتا ہے اور لاشعور جاگ اُٹھتا ہے۔ اب چونکہ تمام خیالات لاشعور میں محفوظ ہیں اس لئے وہاں سے خیالات نزول کر کے شعور میں داخل ہوتے ہیں اور سالک یہ سمجھتا ہے کہ وہ کہیں باہر سے آ رہے ہیں۔ بعض سالکین تو انہیں کشف سمجھتے ہوئے بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ حالانکہ کشف تو اتنی دیر تک ممکن ہی نہیں ہوتا جب تک سالک اپنے

لاشعور کے خیالات سے جان نہیں چھڑوالیتا۔ میں بھی پہلے ان خیالات کو کشف ہی سمجھا کرتا تھا لیکن مجھے جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ میں غلطی پر ہوں۔ بہرکیف میں نے لاشعور پر موجود خیالات کی بھی نفی کرنی شروع کردی۔ اور کافی عرصہ اس کی مشق کرنے کے بعد لاشعور پر ثبت خیالات آہستہ آہستہ ختم ہونا شروع ہوگئے۔ ان کا ختم ہونا تھا کہ روحانی عالم منکشف ہونا شروع ہوگیا۔ پہلے پہل تو کشف ہونا شروع ہوا اور پھر بعد میں دوسرے روحانی عوالم کی سیر بھی میسر آئی۔ یہ سب اللہ رب العزت کی بے پایاں رحمت کا نتیجہ ہے۔ کشف کے متعلق ایک اصول بتاتا چلوں کہ صاحب کشف اگر کشف کے مطابق چلے تو بہت فائدہ اُٹھاتا ہے اور اگر مخالف چلے تو نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی سالک اس طریقہ سے نفی کرے کہ شعور کے ساتھ لاشعور پر ثبت خیالات بھی ختم ہو جائیں تو وہ انشاءاللہ ضرور بالضرور فائز المرام ہوگا۔ قارئین مجلّہ میں نے اپنے تئیں پوری کوشش کی ہے کہ اس مضمون کو آسان الفاظ میں پیش کروں تاکہ آپ لوگوں کی سمجھ میں آسکے۔ یہ تمام چیزیں چونکہ غیر مادی ہیں اس لئے ان کیلئے الفاظ کا چناؤ بہت مشکل امر ہے۔ جن بھائیوں کو سمجھنے میں مشکل پیش آئے ان سے گذارش ہے کہ وہ شیخ سلسلہ جناب محترم باباجان محمد صدیق ڈار صاحب سے رابطہ کریں، کیونکہ یہ سب اُنہی کا فیضانِ نظر ہے نہ کہ مکتب کی کرامت تھی۔

جس کسی نے غصہ جیسے دیو کو زیر کرلیا اس کی قوتِ ارادی اتنی طاقتور ہوجاتی ہے کہ وہ باقی برائیوں کو بھی دُور کرسکتا ہے۔ (چراغِ راہ۔179)

اللہ پر ایمان رکھنے والوں کے قلب میں ایک ایسی حرارت اور برقی طاقت پیدا ہوجاتی ہے جس کے جوش میں وہ بڑی سے بڑی مشقت اور مصیبت کو بھی ہنستے کھیلتے برداشت کرلیتے ہیں اور کبھی تھکتے نہیں۔ (تعمیر ملت۔22)

بسلسلہ تذکرۃ الاولیاء

(حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ)

(ایم طالب)

آپ کی ذات تابعین کی سرتاج ہے رسول اللہ ﷺ نے آپ کی نسبت ارشاد فرمایا ہے۔ ''یعنی حضرت اویس قرنی ؒ احسان اور عطف کی روح سے تابعین میں بہت اچھے ہیں۔ جس شخص کی تعریف خود رحمۃ اللعالمین ﷺ اپنی زبان مبارک سے فرمائیں ان کی تعریف کماحقہ بیان نہیں کی جاسکتی۔

پھر جناب رسول خدا ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ستر ہزار فرشتے حضرت اویس قرنی ؒ کی شکل میں پیدا کر کے ان کے درمیان حضرت اویس قرنی ؒ کو بہشت میں داخل کرے گا۔ تا کہ مخلوق انکو دیکھ نہ سکے۔ سوائے اُس شخص کے جس شخص کو اللہ چاہے گا۔ کہ اُن کی زیارت کرے۔ کیونکہ اویس قرنی ؒ نے دنیا میں محض اس لئے چھپ کر خدا کی عبادت کی کہ دنیا کا کوئی آدمی اس کو نیک نہ سمجھے۔ اس لئے قیامت کے دن بھی اللہ تعالیٰ اس کو مخلوق کی نظروں سے پوشیدہ رکھے گا کیونکہ ''میرے دوست میری قبا کے نیچے ہیں میرے سوا ان کو کوئی نہیں پہچان سکتا''۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میری اُمت میں ایک مرد ایسا ہے جس کی سفارش سے اللہ تعالیٰ میری امت کے اتنے گنہگاروں کو قیامت کے دن بخش دے گا۔ جس قدر قبیلہ ربیعہ اور قبلہ مضر کی بھیڑوں کے بال ہیں'' آپ ؐ کے صحابہ نے عرض کی۔ یا رسول اللہ ﷺ ''وہ شخص کون ہے اور کہاں رہتا ہے''۔ صحابہ کرام ؓ کے سوال پر آپ ؐ نے فرمایا کہ اویس اسکا نام ہے قرن میں (جو علاقہ یمن میں ہے) رہتا ہے۔ صحابہ کرام ؓ کے سوال پر آپ ؐ نے فرمایا ''کہ میں نے اس کو باطنی آنکھوں سے دیکھا ہے'' صحابہ ؓ نے عرض کی آپ کا ایسا دوست حاضرِ خدمت کیوں نہیں ہوا؟ آپ ؐ نے فرمایا کہ دو وجوہات ہیں۔ غلبہ حال اور تعظیم شریعت۔ اس کی والدہ ضعیف، نابینا اور مومنہ ہے۔ وہ شتربانی کر کے اس کی خدمت بجالاتا ہے۔

پھر سوال کیا کہ کیا ہم اس کی زیارت کرسکتے ہیں؟ آپ ؐ نے فرمایا ''نہیں، البتہ حضرت عمر ؓ اور حضرت علی ؓ اس کے پاس جائیں گے''۔ جب تم اس سے ملو۔ میرا سلام کہنا اور میری اُمت کے حق میں دُعا کیلئے التماس کرنا''۔

منقول ہے کہ جب آنحضرت صلعم کے وصال کا وقت قریب آیا تو صحابہؓ نے عرض کی کہ آپؐ کا مرقع کس کو دیا جائے۔ آپؐ نے فرمایا ''اویس قرنیؓ'' کو۔

چنانچہ جب حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے وقت میں جناب فاروق اعظمؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کوفہ میں تشریف لائے تو اہل نجر سے حضرت اویسؓ کا پتہ پوچھا ایک شخص نے اُٹھ کر عرض کی کہ میں اس کو جانتا تو نہیں لیکن ایک دیوانہ سا شتربان ضرور رہتا ہے جو آبادی میں کبھی نہیں آتا۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علی کرم اللہ اس کے بتائے ہوئے پتہ پر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ جناب اویسؓ نماز میں مصروف ہیں۔ پاؤں کی آہٹ محسوس کر کے نماز کو کوتاہ کیا اور السلام علیکم کہا:۔

سلام کے بعد جناب فاروقؓ نے نام پوچھا۔ جواب دیا ''عبداللہ'' حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا ''ہم سب عبداللہ یعنی خدا کے بندے ہیں''۔ اپنا خاص نام ارشاد فرمائیں۔ آپ نے جواب دیا۔ ''اویس'' حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا۔ ''اپنا دائیاں ہاتھ دکھائیں''۔

تب آپ نے اپنا دایاں ہاتھ دکھایا جو نشان جناب رسول مقبول ﷺ نے فرمایا تھا۔ اسکو دیکھ کر جناب فاروقؓ نے فرمایا کہ جناب رسول مقبول ﷺ نے آپ کو سلام بھیجا ہے اور اپنا مرقع ارسال فرمایا ہے اور وصیت فرمائی ہے کہ میری اُمت کیلئے دُعا فرمائیں، آپ نے فرمایا کہ اے عمرؓ آپ مجھ سے بہتر دُعا کر سکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں بھی دُعا کرتا ہوں اور آپ حضور کی وصیت بجا لائیں۔

حضرت اویسؓ نے مرقع لیا اور دُعا کیلئے سر بسجود ہو گئے۔ اور اُمت کیلئے خدا کے حضور دُعا فرمائی۔

اقوال اویس قرنیؓ

1۔ جس شخص نے خدا کو پہچان لیا اس پر کوئی چیز مخفی نہ رہی۔
2۔ تنہائی میں سلامتی ہے۔
3۔ دل کو حاضر رکھنا کہ غیر کو اس میں دخل میسر نہ ہو۔
4۔ سر بلندی عاجزی میں ہے، سرداری سچائی میں ہے فخر فقر میں ہے۔
5۔ نسبت پرہیز گاری میں ہے، بزرگی قناعت میں ہے، استغنا توکل میں ہے۔

قند مکرر

اِنسان ، قرآن اور ماہ رمضان

(قبلہ محمد صدیق ڈار توحیدی)

جب تک انسان کی حقیقت اور اس کی زندگی کا مقصد معلوم نہ ہو دین اسلام کے احکام کی حکمت اور اہمیت اچھی طرح سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے انسانی زندگی کی جو حقیقت سامنے آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس کی ابتدا مادی دنیا سے نہیں ہوتی اور نہ ہی موت اس کا انجام ہے۔ تمام انسانوں کی ارواح روز ازل ہی وجود میں آ گئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارادے کے مطابق اپنی اپنی باری پر اس دنیا میں آ کر جلوہ گر ہوتیں اور مقررہ مدت بسر کرنے کے بعد واپس چلی جاتی ہیں۔ قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کا علم عطا فرما کر ملائکہ پر فضیلت عطا فرمائی لیکن ابلیس نے اس کی برتری تسلیم نہ کی اور اسے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ نسل انسانی کا دشمن بن گیا اور اس کو صراط مستقیم سے ہٹانے کیلئے اپنی ذریت، لاؤلشکر اور تمام حربوں سے لیس پوری طرح مصروف عمل ہے۔ اللہ نے حضرت آدم اور حضرت حوا کو کچھ عرصہ کیلئے جنت میں رکھا تا کہ ان کی ارواح اپنی منزل سے آشنا ہو جائیں۔ اللہ نے انہیں واضح طور پر ایک درخت سے دور رہنے کا حکم فرمایا لیکن ابلیس نے انہیں نافرمانی پر اُکسایا۔ ابلیس نے خود بھی اللہ کے واضح حکم کے باوجود سجدہ نہیں کیا تھا اور منطقی دلائل پیش کرنے کی وجہ سے مردود ہو گیا۔ اس نے ان دونوں کو بھی مختلف دلائل دینے شروع کئے اور ساتھ ہی قسمیں کھا کر اپنی خیر خواہی کا یقین دلا کر فریب دینے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن ابلیس کے برخلاف جو اپنی غلطی پر اکڑ گیا آدم علیہ السلام نے ندامت کا اظہار کیا اور اللہ سے سیکھے ہوئے کلمات کے ذریعے سے مغفرت طلب کی اور اللہ نے انہیں معاف فرما دیا۔ اس سے واضح ہو گیا کہ ازلی اور پیدائشی گناہ کا نظریہ درست نہیں ہے۔ آدم علیہ السلام کو زمین کی خلافت عطا کرنے کیلئے ہی پیدا کیا گیا تھا۔ اس لئے انسان کو اس مادی دنیا میں کسی جرم کی سزا بھگتنے کیلئے نہیں بلکہ اللہ کی عطا کردہ گونا گوں اہلیتوں کے اظہار اور اپنی شخصیت کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہے۔ عالم ارواح ہی میں اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی پشت سے قیامت تک آنے والی تمام ارواح کو نکال کر ان سے اپنی ربوبیت کا پختہ عہد لے لیا تا کہ مادی دنیا کی بھول بھلیوں، عالم اسباب کے پردوں، نفس کی سرکشی اور سفلی لذت میں انہماک کی وجہ سے کوئی انسان اس وہم اور گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ میں بالکل آزاد اور

اپنی مرضی کا مالک ہوں۔ نہ کوئی میرا آقا او ررب ہے اور نہ ہی میں کسی کے سامنے اپنے اعمال کیلئے جوابدہ ہوں۔ یا پھر اللہ کو چھوڑ کر اس کی مخلوق میں سے کسی کو اپنا رب بنا کر ظلم عظیم کا مرتکب ہو جائے۔قرآن وضاحت کرتا ہے کہ یہ عہد اس لئے لیا گیا" تا کہ کوئی انسان روز قیامت یہ نہ کہہ سکے کہ مجھے تو اس کی خبر ہی نہ تھی۔ اور نہ ہی یہ بہانہ بنا سکے کہ آباؤاجداد کی گمراہی کی وجہ سے میں حقیقت کو نہ جان سکا''۔اگر چہ یہ عہد عام انسانوں کو شعوری طور پر ہرگز یاد نہیں لیکن روح کی گہرائیوں میں موجود ہے۔اور مرنے کے بعد جب مادے کے حجابات اُٹھ جائیں گے تو پھر سب کچھ یاد آ جائے گا۔حیات ارضی میں انسان کے طرزِ عمل اور اس کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار اس عہد الست کو تسلیم کر لینے یا اس سے انکار کر دینے پر ہے۔اللہ کی بے پایاں رحمت نے اس عہد پر ہی اکتفا نہ فرمایا بلکہ آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجنے سے پہلے فرمادیا کہ"میری طرف سے تمہیں ہدایت او رراہنمائی آتی رہے گی۔ جو اس پر چلیں گے نہ ان کو کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہونگے اور جو لوگ میری آیات کو نہیں مانیں گے اور جھٹلائیں گے تو وہ آگ کے عذاب کے مستحق ہوں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے"۔(البقرہ۔38۔39)

اس مادی زندگی کی تربیت گاہ میں ہر چیز انسان کی سہولت اور خدمت کیلئے پیدا کی گئی ہے۔ اولادِ آدم کا فرضِ منصبی اور خلافت ارضی کا یہ تقاضا ہے کہ ان تمام چیزوں کو زیرنگیں کر کے اپنی اہلیت کو ثابت کر دے۔اس جدوجہد ہی میں اس کی روح کی ترقی اور شخصیت کی تکمیل کا راز بھی پوشیدہ ہے۔اسلام مادی دنیا سے بیزاری اور رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ اسے تسخیر کر کے آگے ہی آگے بڑھنے اور اللہ کو اپنی منزل بنانے کی ترغیب دیتا ہے۔جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

کمال ترک نہیں آب و گِل سے مہجوری
کمال ترک ہے تسخیر خاکی و نوری

لیکن جو انسان متاع دنیا کو سب کچھ سمجھ کر اس تربیت گاہ ہی سے دل لگا لے اور اللہ کے رسولوں کی یاددہانی کے باوجود بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہ لائے وہ خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائے گا۔اب اس کی نگاہوں سے نہ صرف زندگی کا مقصد اوجھل ہو جائے گا بلکہ اپنی ذات کی حقیقت سے بھی بیگانہ ہو جائے گا۔ایسا انسان سفلی جذبات کی تسکین اور مادی لذات کے حصول میں غرق ہو کر حیوانوں کی سطح پر گر جاتا ہے۔حالانکہ انسان کی فلاح اس امر میں ہے کہ دنیا کی نعمتوں سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے بھی اس کی محبت میں مبتلا نہ ہو کیونکہ ساری خرابی

دنیوی زندگی کو اُخروی زندگی پر ترجیح دینے میں ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کا بھی فرمان ہے۔ **حب الدنیا راس الخطیة** "یعنی دنیا کی محبت ہی ساری خرابیوں کی جڑ ہے"۔ سب سے زیادہ محبت انسان کو اپنے اللہ سے کرنی چاہیے۔ جو اس کا معبود اور محبوب ہے۔ سورۃ البقرہ آیت 165 میں ارشاد ہوا کہ "جو لوگ ایمان والے ہیں وہ تو اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں"۔

صرف اس طرز فکر ہی سے انسان ماسواء اللہ کے خوف سے نجات پا کر حقیقی آزادی اور اشرف المخلوقات کے مقام پر فائز ہوسکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اگر انسان اس حقیقت کو تسلیم کر لے کہ میرا مالک، آقا اور رب اللہ تعالیٰ ہے۔ اس نے موت وحیات اور زمین کی ساری نعمتیں میری تربیت اور آزمائش کیلئے تخلیق فرمائی ہیں۔ مجھے اللہ کے پاس واپس لوٹنا ہے۔ جہاں مادی دنیا میں میری کارکردگی کی مناسبت سے مجھے جزا یا سزا ملے گی۔ تو وہ مومن یعنی حقیقت کو مان لینے والا کہلائے گا۔ اب اسے اپنی حقیقی منزل کی فکر دامنگیر ہو جائے گی۔ کہ کس طرح بھرپور دنیوی زندگی بسر کرتے ہوئے اور اپنی تخلیقی اہلیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے دنیا کے منفی اثرات سے بچ کر اللہ کے قرب کی منزل کی طرف رواں دواں رہ سکے۔ اس جذبہ کو تقویٰ کا نام دیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے معنی خوف ڈر اور پرہیز گاری کے بھی ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ اللہ کی محبت کی کشش کے معنی بھی اس میں پوشیدہ ہیں۔ آپ آسانی کی خاطر تقویٰ کو "فکر منزل" کہہ لیں۔ یہ فکر جس قدر قوی ہوگی اتنا ہی ایک مومن ان خواہشات، لذات اور اعمال سے بچنے کی کوشش کریگا جو اسے اللہ کی یاد سے غافل کردیں وہ اس جدوجہد میں لگ جائے گا۔ کہ زندگی اللہ کی منشاء کے مطابق گذارے تاکہ اس کے قرب اور رضا کا مقام حاصل کر سکے۔ اس طرح بنی نوع انسان دو بنیادی گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اللہ کی الوہیت، رسولوں کی رسالت اور یوم آخرت کا انکار کرنے والے کفار کی ملت اور ان حقائق کو مان کر اللہ کی حاکمیت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے مسلمانوں کی ملت۔ اللہ کے نظام کے تحت کفار کی حمایت کرنے، انہیں اندھیروں کی طرف لیجانے، ان کے برے اعمال کو اپنے فریب سے خوشنما بنا کر دکھانے اور عذاب دوزخ کی طرف لے جانے والے شیاطین کی فوجیں موجود ہیں۔ اس طاغوتی لشکر کا سرکردہ ابلیس ہے۔ اس کے برعکس اہل ایمان کی راہنمائی کرنے اور انہیں کفر وشرک کے

اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لے جانے والے رسولوں کا مبارک گروہ ہے۔ جس کے سردار و سالار حضور ابد قرار، کالی کملی والی سرکار احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ مزید برآں اللہ تعالیٰ خود مومنوں کا مولا، حمائتی اور مددگار ہے۔ اللہ اور اس کے فرشتے اہل ایمان کو اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لے جانے کیلئے ان پر رحمتوں کا نزول فرماتے ہیں۔ (الاحزاب:42)

''اللہ تعالیٰ کے عرش کو اُٹھانے والے اور اس کے گرد جو فرشتے ہیں وہ اللہ کی تسبیح کرتے اور اہل ایمان کیلئے دُعائیں کرتے رہتے ہیں۔ کہ اے اللہ مومنین کی مغفرت فرما انہیں دوزخ کے عذاب سے بچا کر جنت میں داخل فرما۔ اور جو ان کے باپ، دادا اور ان کی بیویوں اور اولاد میں سے نیک ہوں ان کو بھی جنت میں داخل فرما'' (سورۃ المومن 7،8) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنین پر کس قدر رحیم ہیں اور اپنی رحمت سے ان کی مغفرت کیلئے کیا کیا انتظام کر رکھے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے آخری زمانہ کے انسانوں کو گمراہی کے اندھیروں سے نکالنے، ان کو زندگی کی غرض و غایت سے آگاہ کرنے اور اپنے قرب کی طرف لے جانے والی سیدھی راہ کی نشاندہی کرنے کیلئے حضور خاتم النبیین، رحمۃ اللعالمین علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا اور ان پر گذشتہ تمام کتابوں کی تصدیق کرنے والی، قیامت تک آنے والے انسانوں کو ہدایت مہیا کرنے والی اور کامل ترین نظام حیات پیش کرنے والی کتاب ''القرآن'' نازل فرمائی۔ اس کتاب کی فصاحت و بلاغت، اس کا انداز تبشیر و تنذیر، اس میں اللہ کی الوہیت اور ربوبیت پر دیئے گئے ناقابل تردید دلائل، اس میں بیان کردہ قصص وامثال، گذشتہ اقوام وملل کے حالات، اُخروی زندگی کی حقیقت اور اس میں پیش آنے والے واقعات، نیکوکاروں اور مجرموں سے کئے جانے والے معاملات کی تفصیل اپنے اندر غافل دلوں اور خوابیدہ ضمیروں کو بیدار کرنے اور سینوں کو منور کرنے کے ہزارہا سامان لئے ہوئے ہے لیکن اس سے صحیح راہنمائی اور ہدایت حاصل کرنے کیلئے سب سے بنیادی شرط تقویٰ کا ہونا ہے۔ جسے اپنے رب سے ملاقات ہونے کا یقین ہی نہ ہو اس میں صراط مستقیم معلوم کرنے کی طلب بھلا کیونکر ہو سکتی ہے۔ ہر شے کی قدر و قیمت طلب ہی سے متعین ہوتی ہے۔ اگرچہ انسانی تاریخ، فلسفہ، نفسیات، طبیعات، فلکیات اور روحانیات کے غیر مسلم علماء بھی اس کے مطالب و معنی کی گہرائی اور وسعت جان کر حیران و ششدر رہ جاتے اور اپنے اپنے علمی مقام کے مطابق اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن قرآن مجید کا اصل مقصد بنی نوع انسان کو ہدایت مہیا کرنا ہے اور اسے وہی حاصل کر سکتا ہے جس کے اندر تقویٰ، فکر منزل اور ذوقِ پرواز ہوگا۔ جو

شخص اس جذبے سے خالی ہو اس کا علم خواہ کتنا ہی متنوع اور وسیع ہو قرآن کی حقیقی روح سے نا آشنا اور اس سے فیضیاب ہونے سے محروم رہے گا۔ اس کتاب سے ہدایت کا اکتساب تقویٰ کے معیار کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسے جیسے ایک مومن میں تقویٰ بڑھتا چلا جاتا ہے ویسے ویسے قرآن کے اسرار و رموز اور اسلام کی حقانیت کے لیے اس کا سینہ کھلتا چلا جاتا ہے۔ اس سے یہ امر روشن ہو کر سامنے آ گیا کہ قرآنی ہدایت اور تقویٰ میں ایک خصوصی ربط و تعلق ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تقویٰ کس طرح پیدا ہوتا اور ترقی کرتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کی روشنی میں اس کا جواب یہ ہے کہ اس خیر و خوبی کے مصدر کی خشت اول اسلامی طرز حیات کا راہنما اصول کلمہ **لا الٰہ اللّٰہ محمد الرسول اللّٰہ** ہے۔ یعنی انسان سچے دل سے یہ حقیقت تسلیم کر لے کہ میرا معبود اور حاکم اللہ ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور ان کی اطاعت اور اتباع ہی میری دنیوی اور آخروی فلاح ہے۔ تمام آسمانی کتابوں کا بنیادی پیام اور انبیاء کی تعلیم کا خلاصہ اللہ تعالیٰ کی واحدانیت اور یوم آخرت پر ایمان لا کر موت کے بعد والی حقیقی اور ابدی زندگی کو دنیا کی عارضی زندگی پر ترجیح اور فوقیت دینا ہے۔ ان عبادات کی ادائیگی سے ایک مومن اپنا قلبی تعلق متاع دنیا سے توڑ کر اللہ کی ربوبیت کا زبانی اقرار اور عملی اظہار کرتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر نماز ہی کو لے لیں جسے حضور ﷺ نے دین کا ستون اور جنت کی کنجی فرمایا ہے۔ اس کے ذریعے سے مومن تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اپنے گھر، اہل و عیال، کاروبار، ملازمت اور جسمانی راحت و آرام کی محبت کو توڑتا رہتا ہے۔ تاکہ یہ تعلق پختہ ہو کر خسران کا باعث نہ بن جائے۔ وہ متاع غرور اور بتان وہم و گماں سے اپنا رشتہ منقطع کر کے اللہ کے حضور اپنا سر نیاز خم کر کے یہ ثابت کر دیتا ہے۔ کہ اسکی وفاؤں کا قبلہ اور محبت کا مرکز صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی بابرکت ذات ہے اسی طرح زکوٰۃ اور حج بھی مال و زر، اہل و عیال اور ارض وطن کی محبت کو مطلوبہ اعتدال پر لانے اور اللہ سے اپنا تعلق بڑھانے کے وسائل ہیں۔

قرآن کی سورۃ توبہ کی آیت نمبر 111 میں ارشاد ہوا ہے۔ کہ "اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کے اموال اور ان کی جانیں جنت کے بدلے خرید لئے ہیں"۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک حدیث مبارکہ بھی ہے کہ "تم اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنی خواہشات کو اس کے تابع نہ کر لو جو میں لایا ہوں"۔ اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ اور ایمان کا اعلیٰ مقام یہ ہے کہ بندہ اپنی تمام خواہشات کو اپنے رب کی رضا کے ماتحت کر دے۔ اس معیار کے حصول کیلئے

نفس کے سرکش گھوڑے کو اطاعت کی مضبوط لگام دینا اور مادی لذات کی محبت کو منقطع کرنا نہایت ضروری ہے۔ یہ اہم مقصد ایک مربوط اور پر از حکمت تربیتی نظام کا تقاضہ کرتا ہے۔ چنانچہ اسی غرض کیلئے مومنین پر روزے فرض کئے گئے اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا گیا کہ "اللہ کی طرف سے یہ کوئی نیا حکم نہیں ہے بلکہ گذشتہ تمام اُمتوں کو بھی نفس کی اصلاح کر کے تقویٰ کو تقویت دینے کیلئے یہی کارگر نسخہ عطا کیا گیا تھا۔ انسانی نفس کی یہ فطرت ہے کہ فاقے سے کمزور اور مضمحل ہو کر اپنی درندگی اور بہیمیت سے رُک جاتا ہے اور اس کی اس حالت سے فائدہ اُٹھا کر اسے اللہ کی اطاعت اور بندگی کی طرف مائل کیا جا سکتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ درندوں کو سرکس میں مختلف کرتب دکھانے کی تربیت دینے کیلئے بھی پہلے انہیں کئی کئی دن بھوکا پیاسا رکھا جاتا ہے اور پھر اپنی خوراک تک پہنچنے کیلئے مطلوبہ کرتب کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اس لئے مومنین کو یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ روزے کا مقصود بھوکا پیاسا رہنا نہیں بلکہ نفس کی اصلاح کرنا ہے۔ اس لئے اس مقصد کو شعوری طور پر پیش نظر رکھتے ہوئے، بھوک کی حالت میں جسم کے اعضاء اور نفس کی خواہشات کو احکام الٰہی کا پابند بنا کر روزے سے حقیقی فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ تا کہ ایسا نہ ہو کہ حضور ﷺ کی اس حدیث کا مصداق ہم بن جائیں جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ "کئی روزہ دار ایسے ہونگے جنہیں روزے سے بھوک اور پیاس کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا"۔

آخر میں ان حکمتوں اور برکتوں کا ذکر کرنا ہے جو ماہ رمضان ہی کو ماہ صیام قرار دینے میں ہیں۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ انسانوں کی ہدایت کیلئے اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب کے نزول کا شرف ماہ رمضان کو عطا ہوا۔ جس کی وجہ سے یہ مہینہ ہمیشہ کیلئے خصوصی رحمتوں اور برکتوں کا حامل بن گیا ہے۔ اس مہینہ کی ایک خاص رات لیلۃ القدر کو ہزار مہینوں سے بہتر ہونے کی انفرادیت سے نوازا گیا۔ بعض روایات کے مطابق گذشتہ آسمانی کتابیں بھی اسی ماہ مبارک میں اتاری گئی تھیں۔ اس مہینہ میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت ہی مہربان ہوتے ہیں۔ اسی لئے حضور ﷺ نے اسے خاص طور پر اللہ کا مہینہ فرمایا ہے۔ اللہ کی رحمت سے اس میں برائی کے اثرات کم اور نیکی کے ثمرات کئی گنا زیادہ کر دیئے جاتے ہیں۔ جہنم کے دروازے بند اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ اور شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے۔ اسی لئے نفس کو زیر کر کے روحانی قوتوں کو ترقی دینے یعنی تقویٰ کو فروغ دینے کیلئے اس ماہ سے بہتر مہینہ اور کونسا ہو سکتا تھا۔ اس لئے ہماری سہولت کیلئے اللہ رحیم و کریم نے ماہ رمضان ہی کو ماہ صیام قرار دے دیا تا کہ اس کی رحمتیں اور

برکتیں بھی ہماری معاون بن جائیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کیلئے قرآن نازل فرمایا لیکن اس نور سے استفادہ تقویٰ کی عدم موجودگی میں ممکن ہی نہیں چنانچہ قرآن کریم کے شروع ہی میں فرمادیا گیا کہ اس کتاب میں متقین کیلئے ہدایت ہے۔ اِسی مناسبت سے قرآن کے نزول والے بابرکت مہینہ ہی کو تقویٰ کی ترقی کیلئے مخصوص فرمادیا گیا۔ اِسی لئے پورے عالم اسلام میں اس ماہ کے دوران کثرت کے ساتھ قرآن کی تلاوت اور سماعت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ تاکہ روزے سے حاصل ہونے والی روحانی صلاحیت کی بدولت مومنین پر قرآن کی حقانیت روشن سے روشن تر ہوتی چلی جائے اور اسلام ان کے دلوں میں گھر کر جائے اور وہ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو کر اس کے انعام واکرام کے حقدار بن جائیں۔

ماہ صیام کی تربیت اگر پورے اہتمام اور ظاہری اور معنوی لوازمات کی کامل پابندی کے ساتھ مکمل کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ سال کے باقی گیارہ مہینوں میں اس کے اثرات قائم نہ رہیں۔ اگر کبھی تقویٰ میں کمزوری محسوس ہونے لگے تو نفلی اور سنت روزہ سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ روزہ ایک ڈھال ہے۔ تو مومن کو چاہیے کہ اپنے حقیقی دشمن یعنی شیطان کے حملوں کو روکنے کیلئے اس دفاعی ہتھیار کو پوری قوت اور شدت سے استعمال بھی کرے۔ جب بھی شیطان کی طرف سے کسی حرام کام کے ارتکاب کیلئے دل میں وسوسہ پیدا ہو تو مومن کو چاہیے کہ ماہ رمضان کے دوران ضبط نفس کی تربیت کو یاد کرے اور تقویٰ کی اہلیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے نفس کو اللہ کی حکم عدولی سے باز رکھے۔ یہی لمحہ مومن کے ایمان اور تقویٰ کے امتحان کا ہوتا ہے۔ جو مومن بندہ ماہ رمضان میں اپنے رب کے حکم پر روزے کے دوران حلال رزق اور جائز جنسی خواہشات سے بھی اپنے آپ کو روک لیتا ہے۔ اس کیلئے کسی حرام فعل کے ارتکاب یا اللہ کی معصیت سے اپنے آپ کو باز رکھنا تو آسان تر ہوتا ہے۔ ایسے ہی کردار کے حامل لوگ متقین کہلاتے ہیں۔ اللہ کے نزدیک ہم میں سے زیادہ عزت واکرام کا مستحق وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ اور آخرت میں جنت کی نعمتیں بھی متقین کیلئے ہی وقف ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو رمضان المبارک کی برکتوں سے کامل طور پر مستفیض فرما کر متقین اور مقربین میں شامل فرمائے۔ آمین!

تحریک پاکستان اور علماء

(مسعود خان نیازی)

چودھویں صدی ہجری میں مکتب دیوبند، مکتب سہارنپور اور خانقاہ بھون کو اللہ تعالیٰ نے اولیاء کرام کا مسکن بنایا جس میں پیدا ہونیوالے بزرگان دین نے قرآن و سنت اور آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ کی روشنی میں علم و عمل، تقویٰ و پرہیز گاری، سادگی و انکساری اور تصوف میں قرون اولیٰ کی یاد تازہ کی تھی اور اپنے قول و فعل سے ثابت کر دکھایا کہ چودہ سو سال بعد بھی توحید الٰہی پر کامل یقین، احکامات خداوندی پر عمل کر کے اللہ تبارک و تعالیٰ کی نصرت اور خوشنودی حاصل کی جا سکتی ہے اور محبوب خدا ﷺ اور اس کی جماعت کی اطاعت کا عملی نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ آج علم دین کے ان مراکز سے فیض پانے والے دنیا سے رُخصت ہو گئے اور ہم نے ان کے نقش قدم پر چلنا تو درکنار رات دن ان کے مشن کے خلاف برسرپیکار ہیں نیز اپنے ذاتی مفادات اور دنیاوی خواہشات میں ان بزرگان دین کا نام استعمال کرنے کیلئے ان سے رشتہ و تعلق ثابت کرنے اور ان کا جانشین بننے کی کوشش کرتے ہیں مگر ان کے مشن اور ان کے طرز زندگی کو اپنانے سے قاصر ہیں۔ ان اکابرین کی رواداری قول و فعل کی پاسداری، جذبہ حب الوطنی اور ایثار و خلوص اور برداشت جیسی خوبیوں سے ہم عاری ہیں۔ جن خوبیوں کا وہ خود عملی نمونہ تھے اکابرین دیوبند میں جن بزرگوں نے تحریک پاکستان میں سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا ان میں اہم اور قوی آواز حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی تھی۔ مولانا اشرف علی تھانوی مزاج کے لحاظ سے یکسوئی کے ساتھ تبلیغ دین، تعلیم و تربیت اور اصلاح امت کی طرف رجحان رکھتے تھے۔ اس لئے قومی سیاسی تحریکوں میں براہ راست حصہ کی نوبت نہ آئی اور نہ ہی آپ کسی سیاسی یا قومی پارٹی یا تحریک سے منسلک رہے البتہ جب کبھی ملک میں کوئی سیاسی تحریک شروع ہوتی تو اس کے بارے میں ایک ماہر اور شریعت محمدی ﷺ پر عبور حاصل ہونے کی وجہ سے فقیہانہ روشنی ڈال کر نتائج واضح کرنے اور پوری ملت کی علمی اور دینی فرائض کیلئے رہنمائی کرنے میں کبھی بھی دریغ نہ کیا۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ سے رشتے میں بھانجے تھے لیکن حضرت نے بیٹے کی حیثیت سے تربیت کی۔ انہوں نے ابتدائی دینی تعلیم سہارنپور اور کانپور سے حاصل کرنے کے بعد انہی اداروں میں سالہا سال اپنے علمی جوہر دکھاتے رہے اور علمی و تدریسی

فرائض سرانجام دیتے رہے۔حضرت نے جہاں علمی خدمات میں بے شمار واقعات اور کارنامے سر انجام دیئے وہاں سیاسی، سماجی اور اجتماعی خدمات میں بھی پیچھے نہیں رہے۔انہوں نے حکیم الامت حضرت اشرف علی تھانوی کے حکم پر قیام پاکستان کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا اور جدو جہد تحریک پاکستان کیلئے قائداعظم محمد علی جناحؒ کے پاس جانیوالے علماء و مشائخ کے وفود میں نمایاں رہے۔شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نے جب قیام پاکستان کی جدو جہد کیلئے نومبر 1945ء کو کلکتہ میں (JUI) جمعیت علماء اسلام کی بنیاد رکھی تو امیر جمعیت علامہ شبیر احمد عثمانی اور نائب امیر مولانا مولانا ظفر احمد عثمانی چنے گئے اور جس کے مقاصد میں سرفہرست مطالبہ پاکستان کیلئے موثر جدو جہد کرنا تھی۔بحیثیت نائب امیر ہندوستان کے طول وعرض میں پاکستان کے قیام کیلئے رائے عامہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔مفتی محمد شفیع جمعیت کی مجلس عاملہ کے رُکن منتخب ہوئے۔ جمعیت علمائے اسلام نے شہر شہر کانفرنسیں شروع کیں اور قیام پاکستان کے حق میں رات دن جدو جہد میں مصروف رہے۔حیدر آباد (سندھ) میں تاریخی کانفرنس بھی منعقد ہوئی جس میں مسلمانوں کو سلہٹ اور صوبہ سرحد کے ریفرنڈم کی فکر مندی کا اظہار کیا گیا۔3 جون 1947ء کو تقسیم ہند کے اعلان میں سلہٹ اور صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کرانے کا بھی اعلان کیا گیا۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی 11 جون 1947ء کو قائداعظم محمد علی جناح سے بمبئی میں ملاقات کیلئے گئے تو قائداعظم محمد علی جناحؒ نے کھڑے ہو کر ان کا پرجوش استقبال کیا۔ان حضرات نے حصول پاکستان پر قائداعظم کو مبارکباد دی تو قائداعظم نے فرمایا کہ اس مبارکباد کے آپ مستحق ہیں اور آپ کی کوششوں سے یہ کامیابی حاصل ہوئی ہے اس کے بعد قائداعظم نے فرمایا کہ اس وقت اہم مسئلہ سلہٹ اور صوبہ سرحد کے ریفرنڈم کا ہے اگر پاکستان اس ریفرنڈم میں ناکام رہا تو بہت بڑا نقصان ہوگا۔قائداعظم سے حضرات شیخین نے فرمایا کہ انشاء اللہ پاکستان ضرور کامیاب ہوگا بشرطیکہ آپ پاکستان کا آئین اسلامی اور پاکستان میں اسلامی نظام کے جاری ہونے کا اعلان کریں جس پر قائداعظم نے فرمایا ''میں پاکستان کے مقدمے میں مسلمانوں کا وکیل تھا اللہ تعالیٰ نے ان کو اس مقدمہ میں کامیاب کیا پاکستان مل گیا میرا کام ختم ہوا اب مسلمانوں کو اختیار حاصل ہے کہ جس طرح کا چاہیں نظام قائم کریں اور چونکہ پاکستان میں اکثریت مسلمانوں کی ہے تو اس کے سوا کوئی دوسری صورت ہو ہی نہیں سکتی کہ یہاں اسلامی نظام

اوراسلامی ریاست قائم نہ ہو۔اس پر جمعیت کے قائدین نے ترکی کا حوالہ دیا کہ وہ اسلامی ملک ہےمگر آئین اسلامی نہیں۔مسلم لیگ کے متعلق بھی مسلمانوں میں ایسے شکوک ہیں اس پر قائداعظم نے شیخ الاسلام علامہ شبیراحمدعثمانی اور مولانا ظفراحمدعثمانی کو اپنی طرف سے انہیں خود اسلامی آئین اوراسلامی نظام کے جاری کرنے کے اعلان کی اجازت دی کہ پاکستان کا آئین اوراس کا نظام اسلامی ہوگا۔

اِسی ملاقات میں یہ طے ہوا کہ سلہٹ میں حضرت مولانا ظفراحمدعثمانی دورہ کریں گے اور صوبہ سرحد میں علامہ شبیراحمدعثمانی اور مفتی محمد شفیع رائے عامہ ہموار کریں گے چنانچہ سلہٹ کو (مشرقی پاکستان) اورصوبہ سرحد کو مغربی پاکستان میں شامل ہونے کے ریفرنڈم کی کامیابی میں انہوں نے کلیدی کردارادا کیا۔27 رمضان المبارک 1369ھ بمطابق 14 اگست 1947ء کو علماءومشائخ کی انہی خدمات کی بدولت جب پاکستان بنا اور مملکت خداداد کی سرزمین پر پہلی بار (ڈھاکہ)مشرقی پاکستان میں پرچم کشائی کروائی اور(کراچی)مغربی پاکستان میں سب سے لہرانے کا وقت آیا تو قائداعظم نے حضرت مولانا ظفراحمدعثمانی سے مشرقی پاکستان میں پرچم پہلے جشن آزادی منانے کیلئے دیوبند سے شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیراحمدعثمانی اور مفتی محمد شفیع کو مدعو کیا لیکن مفتی صاحب علالت کے باعث تشریف نہ لا سکےاور شیخ الاسلام کراچی تشریف لائے اور قائداعظم کی خواہش پرانہوں نے پہلا پاکستانی ہلالی پرچم لہرایا۔

حضرت مولانا ظفراحمدعثمانی آخر وقت تک دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈو الہ یار(سندھ)میں صحیح بخاری کا درس دیتے رہے وہ کہا کرتے تھے کہ جب ضعف وعلالت اور مرض سے کمزوری کا زیادہ احساس ہونے لگتا ہے تو میں صحیح بخاری شروع کردیتا ہوں اور صحیح بخاری کی برکت سے اللہ تبارک وتعالیٰ صحت اورطاقت عطافرمادیتا ہے۔حضرت مولانا ظفراحمدعثمانی بچاسی سال کی عمر میں ضعف امراض کے ساتھ بھی عبادات کا اہتمام اوروعظ وتبلیغ کا جذبہ جوان رکھتے تھے۔اللہ تعالیٰ ہمارے ان اکابرین کے درجات بلندفرمائے اورہمیں ان کے فیوض وبرکات سے مستفیدفرمائے اوران کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عنایت فرمائے (آمین)

تحریک پاکستان میں اکابرین دیوبند کا تاریخی کردار

اکابر دیوبند میں سے ایک بڑا نام شیخ الاسلام علامہ شبیراحمدعثمانیؒ کا ہے جن کی تحریک پاکستان

میں اس قدر خدمات ہیں کہ کوئی مورخ ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کرسکتا اور ان کے تذکرے کے بغیر نہ ہی کوئی اپنی تحریر آگے بڑھا سکتا ہے۔ اس موقع پر وضاحت بھی نہایت ضروری ہے کہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے ساتھ بے شمار اکابرین دیوبند نے بھی شب و روز قیام پاکستان کیلئے کام کیا اور یہ اکابرین برصغیر کے گلی گلی کوچہ کوچہ پھیلے ہوئے تھے جنکی گنتی اور ان کا احاطہ ناممکن ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جب تک علامہ عثمانیؒ نے مسلم لیگ کی سرپرستی اور حمایت جاری رکھی مسلم لیگ متحرک رہی لیکن قائداعظم اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی وفات کے بعد مسلم لیگ جس زوال کا شکار ہوئی وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں اور نہ ہی اس کی تفصیل کسی بحث کی محتاج ہے۔

1911ء جنگ بلقان و طرابلس کے مصیبت زدہ بھائیوں کی امداد سے اپنی سیاسی زندگی جمعیت الانصار ہند کا قیام عمل میں لاکر شروع کی جس کے وہ پہلے سربراہ تھے۔ 1912ء سے 1918ء تک تحریک خلافت میں شرکت کر کے خلافت عثمانیہ کی بحالی کیلئے جدوجہد کی 1919ء میں جمعیت علمائے ہند کا قیام عمل میں آیا اور 1920ء میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے جمعیت علمائے ہند کی مجلس عاملہ کے رکن کی حیثیت سے دہلی کے ایک عظیم الشان جلسے سے خطاب فرمایا۔ اس جلسے کی صدارت اسیر مالٹا شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ نے فرمائی اور بعد ازاں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے شیخ الہند حضرت محمود حسنؒ کی قیادت میں پورے برصغیر کا دورہ کیا اور مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگایا قبل ازیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ حکومت الٰہیہ کا تصور پیش کر چکے تھے اور اب ضرورت اس بات کی تھی کہ اس تصور کو عملی جامہ پہنایا جائے۔

تحریک پاکستان میں قائداعظم محمد علی جناح اور مسلم لیگ کے کارکنان نے قابل قدر خدمات سرانجام دیں لیکن تحریک پاکستان میں برصغیر کے علماء و مشائخ نے بھی ناقابل فراموش کردار ادا کیا جس میں تحریک خلافت، تحریک ریشمی رومال اور تحریک آزادی کے علاوہ احیائے اسلام کی کئی تحریکیں اور اکابرین شامل ہیں جنہوں نے اپنے اپنے پلیٹ فارم سے اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی برتری کے ایک ہی ایجنڈے پر قریہ قریہ کوچہ کوچہ جدوجہد کی۔ تحریک پاکستان میں اکابرین دیوبند کا نہ ہی ذاتی مفاد اور نہ ہی کسی قسم کا لالچ و طمع تھا بلکہ یہ بے غرض اور پرخلوص قائدین اپنی سچی، سادہ اور اصولوں پر مبنی بے داغ زندگی و کردار کی بدولت مسلمانوں میں فکر و عمل کی روح پھونک کر جذبہ آزادی اور اسلامی اقدار اور شعائر کی ترویج کی کوشش کرتے رہے۔ اللہ

تبارک وتعالیٰ نے ان کی ان کاوشوں کو شرف قبولیت بخشا اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اکابرین دیوبند نے تحریک پاکستان میں جس فراست اور استقامت کا مظاہرہ کیا وہ ایک ناقابل فراموش درخشاں باب کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر ہم نے اس مملکت خداداد کے تحفظ و استحکام کیلئے زبانی جمع وخرچ کی بجائے حقیقی جذبہ حب الوطنی کے تحت خدمت کرنی ہے تو اپنے اکابرین اور اسلاف کی طرح ان تحریکوں کے اغراض و مقاصد اور انکے مشن کو اپنی خواہشات اور ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھ کر جاری وساری رکھنا ہوگا۔ اس میں شک کی گنجائش ہی نہیں کہ اس فکری مہم میں اپنوں اور بیگانوں نے ملکر رکاوٹیں کھڑی کیں مگر انہوں نے بغیر پرواکئے اپنی منزل پاکستان پاکر ہی دم لیا۔

قرارداد پاکستان کے منظور ہونے کے بعد علماء مشائخ دو گروپوں میں تقسیم ہو گئے پہلے گروپ جس کی قیادت مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے رفقاء کانگریس کی قیادت میں متحدہ قومیت کے نظریہ اور متحدہ ہندوستان کی حمایت کی جبکہ دوسرے گروپ کی قیادت حکیم الامت حضرت اشرف علی تھانویؒ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی و دیگر اکابرین دیوبند نے دو قومی نظریہ اور آزاد و خود مختار پاکستان کی حمایت کی جس میں ان اکابر دیوبند کا موقف یہ تھا کہ مسلمانوں کی تہذیب وتمدن، معیشت، صنعت وتجارت، ثقافت و کلچر اور سیاسی اقتدار و غلبہ کیلئے ایک علیحدہ ریاست ہونی چاہئے نیز اسلام کی سربلندی اور اُمت محمد ﷺ کی رہنمائی کیلئے ایک خالصتاً اسلامی مملکت کا وجود ناگزیر سمجھا۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ کے معتمد ساتھی حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی ؒ نے فتویٰ دیا کہ ''کفار ومشرکین کے جھنڈے تلے کسی تحریک میں شامل ہونا حرام ہے اور کانگریس کو تقویت دینا ہرگز جائز نہیں''۔ اس نقطہ پر بے شمار اکابرین دیوبند کا اتفاق تھا جس سے مسلم لیگ کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہوا اور تحریک قیام پاکستان نے زور پکڑ لیا۔ الحمدللہ اکابرین دیوبند نے انتہائی جاں فشانی اور بصیرت کے ساتھ اپنے تاریخی مقصد میں کامیاب ہو کر اُمت مسلمہ کو عموماً اور مسلمانان پاکستان کو خصوصاً مملکت پاکستان کا انمول تحفہ دیا۔ تحریک آزادی میں تمام اکابرین کو اللہ تبارک وتعالیٰ کروٹ کروٹ راحت و آرام نصیب فرمائے۔ (آمین)

(بشکریہ نوائے وقت)

کیا محنت مقدر کے تابع ہے ؟

(عاصم ندیم)

پچھلے دنوں توحید ویب فورم پر جس مکالمے کا آغاز کیا گیا اس کا عنوان تھا ''کیا محنت مقدر کے تابع ہے؟'' اس سلسلے میں مختلف بھائیوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا جو نظر قارئین ہے۔

1۔اسلام آباد سے تشاور صاحب لکھتے ہیں: آپ کا سوال یقیناً بہت اہم ہے۔لیکن میرا خیال ہے کہ محنت مقدر کے تابع نہیں بلکہ مقدر محنت کے تابع ہے۔میں نے قرآن میں پڑھا ہے کہ ''انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی اس نے کوشش کی''۔اس لیے محنت ہی مقدر بناتی ہے۔ اگر چہ میں اسی فلسفے پر قائم ہوں لیکن پھر بھی تھوڑا سا کنفیوز ہوں۔کیونکہ میں نے بارہا ایسے خواب دیکھے جو بعد میں سچ ہوئے۔اس لیے پریشان ہوں کہ اگر کوئی عمل پہلے سے ہی طے شدہ ہے تو پھر محنت کیا ہے؟ جزا اور سزا کی کیا حقیقت ہے؟ میں آپ کے تفصیلی جواب کا منتظر رہوں گا۔

2۔فہیم صاحب: گوجرانوالہ سے لکھتے ہیں۔یہ سوال بہت ہی پیچیدہ ہے۔کیونکہ ہم روزمرہ معمولات میں دیکھتے ہیں کہ دو اشخاص ایک کام کو ایک جتنی محنت کر کے بھی ایک جیسا نتیجہ نہیں نکال سکتے۔مثال کے طور پر دو کان دار ایک بازار میں بیٹھے ایک جیسی پروڈکٹ فروخت کرتے ہیں لیکن رات کو دونوں کی آمدنی مختلف ہوگی۔ایک مزدور چاہے جتنی ہی محنت کر لے لیکن وہ اس بچے جتنی آسائشیں حاصل نہیں کر سکتا جو ایک امیر گھر میں پیدا ہوا ہو۔

اب ہم اللہ کے راستے کی جانب محنت اور مقدر کا جائزہ لیتے ہیں۔

شیطان نے اپنی محنت کو عبادات و ریاضت میں صرف کر کے اللہ کا قرب حاصل کیا لیکن ایک نافرمانی سے راندہ درگاہ ہوا۔

حضرت یوسفؑ نے مصر کا بادشاہ بننے کے لیے کوئی خصوصی محنت نہ کی لیکن بادشاہ بنا دیے گئے۔دراصل ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی سوچ کا احاطہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ہمارے پاس قرآن اور سنت دو ایسے ذرائع ہیں جن کی مدد سے مقدر اور محنت کے تعلق کو کسی حد تک سمجھا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے ''ہر انسان کا شگون ہم نے اس کے گلے میں لٹکا رکھا ہے''۔اس کا

کیا مطلب ہے۔میرے خیال کے مطابق ہر انسان کے روزانہ کے معمولات کی ڈائری پہلے ہی لکھی جا چکی ہے۔

3۔عاصم ندیم لکھتے ہیں: خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے اپنی کتاب ''تعمیر ملت'' میں مسئلہ جبر و قدر کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔میں صرف اسی کو بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔آپ لکھتے ہیں۔

''بے شبہ قرآن میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوتا، وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے، لیکن اسی قرآن میں ان سے کہیں زیادہ آیات ایسی بھی جن میں حکم دیا گیا ہے کہ ''عمل کرو'' ''عمل کرو'' ''عمل صالح کرو'' ''کوشش کرو'' کہ تمہارے لئے سوائے کوشش کے اور کچھ نہیں ہے۔ان آیات کا ملا جلا مفہوم بعض آدمی یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ جو عمل ہم کرتے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کراتا ہے حتیٰ کہ گناہ بھی۔مگر بات یہ ہے کہ تم عمل ضرور کرو کہ تمہارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں، لیکن اس بھول میں کبھی مبتلا نہ ہو کہ تمہارے اعمال کا نتیجہ بھی وہی ہوگا جو تم چاہتے ہو، نہیں بلکہ ان کا نتیجہ وہی ہوگا جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اعمال میں تو مختار ہو لیکن ان کے نتائج میں مجبور۔مشاہدہ بھی یہی کہتا ہے کہ ہزاروں آدمی کوئی خاص مقصد حاصل کرنے کیلئے پوری جدوجہد کرتے ہیں لیکن ناکام رہتے ہیں۔عقل بھی یہی کہتی ہے کہ اگر انسان اپنے اعمال وافعال کے نتائج پر قادر ہوتا تو ہر انسان بادشاہ بننے کی کوشش کرتا اور آج ہر انسان دنیا میں بادشاہ ہوتا، لیکن ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ اعمال و افعال کے نتائج صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔اعمال وافعال کا نتیجہ کسی طرح بھی انسان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، یہی حقیقت ہے اور اس حقیقت کو قرآن کریم میں بہ اندازِ خاص ظاہر کر کے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان عظیم فرمایا ہے۔کیونکہ اِس تعلیم قرآنی کا نفسیاتی فائدہ یہ ہے کہ اگر مسلمان کسی کام میں سخت محنت اور جدوجہد کرنے کے بعد بھی ناکامیاب ہو تو ہمت نہ ہارے، مایوس نہ ہو اور دل شکستہ ہو کر سست اعمالی میں مبتلا نہ ہونے پائے بلکہ یہ سمجھ کر خوش اور مطمئن ہو جائے کہ اگر اِس کام کا وہی نتیجہ نکلتا جو میں چاہتا تھا تو میرے

لئے سخت مضر او رنقصان دہ ہوتا اور سوچئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ بھی تو کہا ہے کہ ''بعض باتوں کو تم اپنے لئے اچھا سمجھتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کو تمہارے لئے اچھا نہیں سمجھا'' اب اگر نفسیاتی نقطۂ نظر سے اِس تعلیم پر غور کیا جائے تو صاف سمجھ میں آ جائے گا کہ انسان کو سرگرمِ عمل رکھنے کیلئے اِس سے بہتر طریقہ تعلیم ہو ہی نہیں سکتا''۔

4۔حافظ آصف صاحب گکھڑ سے لکھتے ہیں: تقدیر کے متعلق اگرچہ بہت کچھ لکھا گیا لیکن میں یہاں اپنے خیالات کی عکاسی کرنے کیلئے ایک کتاب ''تلاشِ حقیقت'' کا اقتباس لکھنا چاہوں گا۔مصنف لکھتا ہے کہ ''تقدیر دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں انسان کا امتحانی پرچہ ہے۔دنیا ایک امتحانی تجربگاہ ہے۔جس میں امتحان کی غرض سے انسان کو گزارا جاتا ہے۔جس کا مقصد انسان کے ردِعمل کو دیکھنا ہے۔چنانچہ ایک ہی تقدیر پر مختلف انسان مختلف ردِعمل ظاہر کرتے ہیں اور ان کے درجات میں تفریق کا باعث بنتے ہیں۔انسان تقدیر کا ذمہ دار نہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔جو ممتحن ہے وہ اس کے ردِعمل کو دیکھتا ہے۔اس کی مثال تھیٹر کے کرداروں کو دیئے گئے رول پر ان کی کارکردگی کی سی ہے۔

اس کی مثال تھیٹر میں کام کرنے والے فنکاروں کی سی ہے۔جو کہ تھیٹر پر کام کر کے داد وصول کرتے ہیں۔یہ ڈرامہ نگار پر ہے۔کہ وہ کونسا کردار کس کو دیتا ہے۔وہ ایک کو بادشاہ کا کردار دیتا ہے۔تو دوسرے کو فقیر کا۔اب یہ فنکار کی صلاحیت پر منحصر ہے۔کہ دیکھنے والوں سے کیسے داد وصول کرتا ہے۔جو جتنی اپنے کردار پر محنت کریگا اُس کو اُتنی ہی داد ملے گی۔قطع نظر اس کے کہ وہ بادشاہ کا کردار ادا کر رہا ہے، کہ فقیر کا۔پس اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ محنت کر کے ہی اپنے مقدر کو سنوارا جاسکتا ہے۔

5۔عائشہ خان لندن سے لکھتی ہیں: کیا ہم اپنا مقدر خود منتخب کرتے ہیں یا کہ ہم کسی ڈرامے کے کردار ہیں؟

یہ یقین بہت سے سوالات اُٹھاتا ہے۔اگر اللہ پہلے سے ہی جانتا ہے کہ ہمارے ساتھ کیا ہوگا تو ہم اپنے اعمال میں کس طرح خود مختار ہیں؟ ہم اپنا مقدر کس طرح منتخب کر سکتے ہیں؟ کیا خدا

نے ہمیں ایک کردار کے طور پر پیدا کیا ہے؟ یقیناً وہ ہماری شخصیت اور صلاحیتوں کو اسی طرح پہلے سے جانتا ہے جس طرح ایک مصنف اپنے ان تمام کرداروں کے بارے میں جانتا ہے جو اس نے اپنے ڈرامے کیلئے سوچ رکھے ہیں۔

اسلام میں، یہ بات بنیادی عقیدے پر مشتمل ہے کہ ہر شخص کو صحیح یا غلط راستے کے چننے کی آزادی ہے۔ بعض دفعہ ہمیں صحیح راستہ چننے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن مرنے کے بعد یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ ہمارا منتخب شدہ غلط تھا یا کہ صحیح۔

یہ یقین مزید ایک یقین پیدا کرتا ہے کہ اللہ ہم سے اعلیٰ و ارفع ہے اور وہ جانتا ہے کہ ہم کون سا راستہ چنیں گے اور اس پر کیسے چلیں گے۔ یہ یقیناً بہت مناسب سوالات ہیں اگر اسے ایک شخص کے طور پر دیکھیں جو ایک ڈرامہ لکھ رہا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ خدا کو ہم ایک شخص کے طور پر کیسے دیکھیں۔ خدا ایک شخص نہیں ہے۔ وہ ایک حقیقت ہے۔ ایک وجہ جس کی کی کوئی وجہ نہیں بیان کی جا سکتی۔ خدا کو ایک شخص کے طور پر دیکھنا ان سوالات کی نفی کرتا ہے۔ اس لئے یہ تمام سوالات کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اوپر دیے گئے سوالوں کے جواب میں ایک مثال دیتی ہوں۔ جس سے یہ بات کسی حد تک واضح ہو جائے گی کہ ہم اپنے اعمال میں خود مختار ہیں اور ہمارا مقدر پہلے سے طے شدہ نہیں۔ میں اس کی وضاحت اس طرح کرتی ہوں کہ اگر ایک بندہ ٹائم مشین ایجاد کرتا ہے اور اپنے دوست کا مقدر جاننے کیلئے مستقبل کا سفر کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کا دوست مستقبل میں کس طرح کی زندگی گزارے گا اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ یہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا یہ جاننا اس کے دوست کے اعمال کی خود مختاری پر اثر انداز نہیں ہوا۔ اب اگر اس کے دوست نے ابھی کوئی راستہ نہیں چنا لیکن وہ جانتا ہے کہ وہ کونسا راستہ چنے گا۔

اگرچہ یہ مثال ناکافی ہے لیکن اس حوالے سے تھوڑا وزن رکھتی ہے کہ اللہ تو لافانی اور تمام قدرتوں کا مالک ہے۔ اسے کسی کا مقدر جاننے کیلئے مستقبل یا ماضی میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر ہم اسلام کے پیرائے میں ان سوالوں کے جواب تلاش کریں تو ایک بات واضح ہوتی ہے اور وہ ہے ہمارا یقین کامل۔ اگر اس بات پر یقین ہے کہ خدا نے ہمیں ہمارے اعمال کے حوالے سے خود

مختار بنایا ہے تو اپنا مقدر خود بنانے کی کوشش کرو۔ اور اگر ہمارا یقین پختہ نہیں تو ہم یقیناً زندگی کو ایسے ہی گزرنے دیں گے اور کسی بھی موقعے سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہ کریں گے۔ ''تم مقدر بناتے ہو مقدر تمہیں نہیں بناتا اس کا تعلق یقین سے ہے کیا یہ ہمارے پاس ہے؟

6۔ محمد ارسلان لندن سے لکھتے ہیں: میں نے آپ کا آرٹیکل پڑھا اور اس نے مجھے ایک واقعہ یاد دلا دیا جو میں نے صوفی ازم کی ایک کتاب سے پڑھا تھا۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ ''ایک دفعہ ایک نوجوان شاگرد اپنے روحانی اُستاد کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے بتایئے کہ میں کس سے شادی کروں؟ اس کے اُستاد نے کہا کہ یہ پہلے سے ہی لکھا جا چکا ہے۔ کہ تم کس سے شادی کرو گے۔ یہ بات سن کر اس نوجوان نے کہا اگر یہ سب پہلے سے طے شدہ ہے تو پھر میری خود مختاری کیا ہوئی؟ اس کے اُستاد نے کہا اچھا میں ایک کاغذ پر ایک نام لکھتا ہوں۔ تم جاؤ اور جس سے چاہتے ہو شادی کرلو۔ اس دوران یہ کاغذ لفافے میں بند رہے گا اور تمہاری شادی والے دن ہی کھلے گا۔ تین ہفتے بعد اس نوجوان نے ایک لڑکی کا اِنتخاب کیا جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔ شادی والے دن وہ لفافہ سب کے سامنے کھولا گیا اور اس لفافے میں پڑے کاغذ پر اسی لڑکی کا نام تھا جس سے وہ شادی کرنے جا رہا تھا۔ اِسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھا ہے کہ اگر آپ سفر کر رہے ہوں اور آگے وہ راستہ مزید تین راستوں میں تبدیل ہو جائے اور آپ یہ نہ جانتے ہوں کہ کونسے راستے پر جانا ہے اس وقت وہ تمام راستے آپ کے انتخاب کیلئے موجود ہوتے ہیں۔ یہ آپ کی وہ خود مختاری ہے جس کے تحت آپ کوئی بھی فیصلہ کرسکتے ہیں۔ اب اگر آپ ایک راستے کا انتخاب کر کے اس پر چل پڑتے ہیں تو وہ آپ کا مقدر ہے۔ ہماری خود مختاری کی بھی حدود ہیں جن کو ہم کراس نہیں کر سکتے۔ ایک شیر کا مقدر شیر ہے۔ ایک کوا کبھی بھی شیر نہیں بن سکتا اور اسی طرح ایک شیر کبھی بھی کوا نہیں بن سکتا۔ اِسی طرح مختلف انسان اگر چہ ایک جیسے حقوق رکھتے ہیں لیکن سب کی صلاحیتیں جدا جدا ہیں۔ ہم اپنی عادات و اطوار کو اپنی محنت سے سنوار سکتے ہیں مگر ان کو مکمل طور پر تبدیل نہیں کر سکتے۔ یہی وہ محدود خود مختاری ہے جو ہمارے مقدر کا احاطہ کرتی ہے۔

کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟

اہل پاکستان سے پاکستان کا سوال

(محمد صلاح الدین شہید)

میں پاکستان ہوں ۔۔۔۔۔۔ تمہاری مادر وطن!

تمہاری اکثریت نے میری کوکھ سے جنم لیا، میری آغوش میں پرورش پائی اور میرے سینے سے اپنی غذا حاصل کی۔ تم میں وہ بھی ہیں جنہوں نے ترک وطن کر کے میری آغوش میں پناہ حاصل کی۔ میرے سایہ عاطفت میں اپنی نئی دنیا بنائی۔ مجھے تم سب سے پیار ہے، محبت ہے، تم میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون ہو۔

ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے تم نے 23 مارچ کو بڑی دھوم دھام سے میرا جشن منایا۔ مجھے خراج تحسین وعقیدت پیش کیا۔ میرے احسانات گنوائے، میری راہ میں قربانی دینے والوں کو ہدیہ تشکر پیش کیا اور میری خدمت وحفاظت کیلئے بڑے بلند عزائم کا اظہار کیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی، اللہ تم سب کو جیتا رکھے، خوش وخرم رکھے، تمہارے دم سے ہی تو میری دنیا آباد ہے۔۔ مگر تم جب یوم پاکستان یا یوم استقلال مناتے ہو، میرے دل میں خوشی کے ساتھ ساتھ ایک کسک بھی اُٹھتی ہے۔ ذہن میں ایک سوال کلبلانے لگتا ہے۔ تم مجھے پہچانتے بھی ہو؟ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ تم سے کیا امیدیں رکھتی ہوں؟ تمہارے سلوک سے مطمئن ہوں یا کبیدہ خاطر؟ تم کبھی سنجیدگی سے ان باتوں پر غور نہیں کرتے۔ تمہیں بے فکر دیکھ کر خوشی بھی ہوتی ہے اور فکر سے خالی دیکھ کر رنج بھی۔ تم مجھ سے بڑا سرسری سا اور غیر شعوری محبت کا رشتہ رکھتے ہو، میری آرزو یہ ہے کہ تم میرے وجود میں جھانک کر میری باطنی صفات اور میری حقیقت کو جاننے کی کوشش کرو۔ اس شعوری اور معرفتی محبت کے بغیر تم میری محبت کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ میرے وجود کی سلامتی اور اس کے تحفظ کا فرض ادا نہیں کر سکتے۔ یہ تمہاری شعور و آگہی سے عاری محبت ہی تو تھی کہ 1971ء میں میرے وجود کو دو ٹکڑے کر دیا گیا تم اسے بچا نہ سکے۔ تمہاری بے حسی اور سنگدلی کی انتہا یہ ہے کہ تم

نے میرے نصف سے بھی کم رہ جانے والے جسم کو ''نیا پاکستان'' قرار دیکر اپنے احساس شکست و زیاں کو نشۂ فتحمندی میں چھپانے کی بڑی بھونڈی اور المناک کوشش کی۔ قائداعظم کے پاکستان کو جس شخص نے دولخت کیا، تم نے اسے ''قائدعوام'' کا خطاب دے کر قائداعظم کی کھلی توہین کی۔ اور میرے رستے زخموں پر نمک چھڑکا۔ اب میں پھر محسوس کر رہی ہوں کہ تمہاری بے حسی، بے شعوری اور غفلت و کوتاہی سے کہیں میرے بچے کھچے وجود کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو جائے۔ میرا وجود پہلے بھی تمہاری جنگ اقتدار میں روندا گیا تھا۔ تم آج بھی اسی میں اُلجھے اور گتھے ہوئے ہو، تمہاری آنکھیں موندی ہوئی ہیں، تم اُس وقت بھی سنگین بحران اور خطرات کے طوفان میں ''سب خیریت ہے'' کی خبر دیا کرتے تھے اور آج بھی ''سیلاب تیز گام'' میں قوم کو جھوٹی تسلیاں دے کر اپنے اقتدار کو بچانے اور میرے وجود کو داؤ پر لگانے کی حماقت میں مبتلا ہونے کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ صورت حال کی اس سنگینی نے مجھے تم سے براہ راست مخاطب ہونے اور یہ پوچھنے پر مجبور کیا ہے کہ تم مجھے پہچانتے بھی ہو؟ تم نے کبھی غور کیا کہ مجھے خداداد پاکستان کیوں کہا جاتا ہے۔ ان تین لفظوں میں کیا حقیقت اور معنویت چھپی ہوئی ہے؟

تم نے کبھی سوچا کہ ماں سے صرف مفاد کا رشتہ رکھنے والی اولاد کبھی ماں کی محبت، اس کی طویل مشقت، اس کی قربانیوں اور اس کی امیدوں، آرزوؤں اور تمناؤں کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ میرا دکھ یہی تو ہے کہ تم نے مجھ سے اپنا رشتہ مفاد تک محدود رکھا ہے۔ تم اپنے بارے میں اپنی اولاد، اپنی بیوی اور ان سب کی صحت و عافیت، خوشحالی اور ترقی کے بارے میں ان کو عمدہ مکان، بہترین سامان زیست اور دیگر اسباب تعیش و مسرت کی فراہمی کے بارے میں جتنا کچھ سوچتے رہتے ہو کیا اس کے عشر عشیر بھی میری صحت و سلامتی اور میری ضروریات کے بارے میں سوچا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں! مجھے تمہارے اس منفی رویہ سے خود تمہاری عافیت و سلامتی کے بارے میں ہر وقت دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ تمہاری بے اعتنائی اور لاپروائی سے مجھے کچھ ہو گیا، میرا سایۂ شفقت و محبت خدانخواستہ تمہارے سر سے اٹھ گیا، میری گود اور آغوش سے تم محروم ہو گئے تو تمہارا

اور تمہاری نسلوں کا کیا بنے گا؟

ذرا غور سے سنو اور میری حقیقت کو، میری روح کو، میری ضروریات اور توقعات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میری جڑوں (Roots) کو خاموش اور مفلوج تماشائی کی طرح کٹتے دیکھتے رہو گے تو کس کی شاخوں پر اپنا آشیانہ قائم رکھ سکو گے؟ یہ وطن، یہ تمہاری مملکت خداداد پاکستان تمہارے لئے اللہ کا ایسا ہی انعام ہے جیسا انعام اللہ نے جنگ بدر کے بعد ریاست مدینہ میں اہل ایمان کو عطا کیا اور اس کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے انہیں بتایا تھا کہ یاد کرو وہ وقت جب تم تھوڑے تھے، زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا، تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں مٹا نہ دیں۔ پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی اور اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کئے اور تمہیں اچھا رزق پہنچایا، شاید کہ تم شکر گزار بنو۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جانتے بوجھتے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو۔ اپنی امانتوں میں غداری کے مرتکب نہ بنو اور جان رکھو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد حقیقت میں سامان آزمائش ہیں اور اللہ کے پاس اجر دینے کیلئے بہت کچھ ہے۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر تم خدا خوفی اختیار کرو گے تو اللہ تمہارے لئے (کامیابی کی) کسوٹی بہم پہنچائے گا اور تمہاری برائیوں کو تم سے دور کر دے گا اور تمہارے قصور معاف کر دے گا۔ اللہ بڑا ہی فضل فرمانے والا ہے۔ (انفال 26۔29)

ان آیات کے ایک ایک لفظ پر ٹھہر ٹھہر کر سنجیدگی سے غور کرو، کیا پوری تاریخ اسلام میں ریاست مدینہ کے بعد ان کا اطلاق پاکستان اور اہل پاکستان کے سوا کسی اور اسلامی ریاست پر ہوتا ہے؟ جیسے اہل مدینہ کے بعد اللہ تعالیٰ تم پاکستانیوں سے براہ راست مخاطب ہو۔ اس گہری مماثلت کے کئی اسباب ہیں۔ ریاست مدینہ کے تشکیلی مراحل کی طرح پاکستان کے تشکیلی مراحل میں بھی کلمہ طیبہ کی بنیاد پر پہلے ایک جداگانہ قوم کی تخلیق ہوئی۔ پھر ایک طرف کفار اور مشرکین کے مظالم اور دوسرے طرف اہل ایمان کی استقامت اور عزیمت کی آزمائش کا سلسلہ شروع ہوا۔ شعب ابی طالب کے تجربات بھی دہرائے گئے۔ رنگ، نسل، علاقے اور زبان کے رشتے منقطع

کر کے اُمتِ واحدہ کے تصور کے تحت حبشہ کے بلال، روم کے صہیب، فارس کے سلمان اور مکہ کے مسلمانوں کو رشتہ اخوت میں پرونے کا اعادہ ہوا اور یہاں بنگالی، بہاری، گجراتی، مدراسی، گنگا جمنی، راجھستانی، پنجابی، پٹھان، بلوچی، سندھی اور کشمیری مسلمان کو ایک لڑی میں پرو کر متحدہ مسلم قومیت کے قالب میں ڈھال دیا گیا۔ ہجرت بھی ہوئی، گھر بار اور آبائی وطن سب چھوٹے، راستے میں غار ثور کی طرح تعاقب بھی ہوا، منزل تک پہنچتے پہنچتے راہِ حق کے مسافر جان سے بھی گزرے، پھر مواخات کے مناظر محدود مفقود کیوں ہو گئے؟ تم اپنے بچوں کو ایک نصاب کے تحت اور ایک ہی درسگاہ کی چھت کے نیچے تعلیم دینے پر کیوں رضامند نہیں؟ تمہارے دل اُمیدوں سے خالی، خوف اور اندیشوں سے کیوں بھر گئے؟ یہی تو وہ سیاہ داغ ہیں جو مجھے بے چین کئے رہتے ہیں۔ مگر تم میری بے چینی، میرے اضطراب سے بالکل بے نیاز ہو۔

تمہاری مثال اس اولاد کی طرح ہے جو اپنی ماں کی سالگرہ تو بڑی دھوم دھام سے مناتی ہے مگر نہ اس کی کوئی بات سنتی ہے اور نہ اس کی بیماری سے نجات دلانے کیلئے کوئی دوا اور علاج کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔ تم نے میری آرزوؤں کا خون کر دیا، میرا حلیہ کیا تھا، تم نے کیا بنا دیا؟ میں تو بستر سے لگ کر دل مسوس کر اور اپنی امیدوں کا گلہ گھونٹ کر بھی تمہاری خوشیوں میں خوش رہوں گی۔ مگر کیا تم اپنے ان لچھنوں کے باوجود یہ دعویٰ کرسکو گے کہ تم نے اپنی ماں کا حق ادا کر دیا؟ سوچو، غور کرو اور اپنے دل کا جواب اپنے دماغ تک پہنچاؤ۔ شاید تم شکر گزار بننے کی روش اختیار کرسکو، شاید تم کفرانِ نعمت سے باز آ جاؤ۔

اللہ تم پر رحم فرمائے۔ اللہ میری آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سکینت عطا فرمائے آمین۔

ناسا(NASA) کی تصاویر کی حقیقت

(ڈاکٹرعبدالغنی فاروق)

قرآن پاک جہنم کے ذکر سے بھرا پڑا ہے اور نبی اکرمﷺ نے اس کی تفصیلات کا جابجا تذکرہ فرمایا ہے۔جہنم کی دہشت ناکی کا یہ عالم ہے کہ حضورؐ اُن سورتوں کو پڑھتے ہوئے جن میں عذاب جہنم کا ذکر ہے، سخت خوفزدہ ہوکر رویا کرتے تھے۔فرمایا کہ مجھے سورہ تکویر، انفطار اور انشقاق نے بوڑھا کردیا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں جہنم کی دہشت کا جو نقشہ نظر آتا ہے وہ مختصراً یوں ہے۔

سورۃ الفرقان ۲۵ آیات ۱۱-۱۴ میں ہے: ''اور جو اُس گھڑی کو جھٹلائے اُس کیلئے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کررکھی ہے۔وہ جب دور سے اُن کو دیکھے گی تو یہ اُس کے غضب اور جوش کی آوازیں سن لیں گے اور جب یہ دست و پابستہ اُس میں ایک تنگ جگہ ٹھونسے جائیں گے تو اپنی موت کو پکارنے لگیں گے (اُس وقت اُن سے کہا جائے گا) آج ایک موت کو نہیں، بہت سی موتوں کو پکارو''۔

سورۃ الملک ۶۷ آیات ۷، ۸: ''جب کافر جہنم میں پھینکے جائیں گے تو وہ جہنم کے دھاڑنے کی خوفناک آوازیں سنیں گے۔جہنم جوش کھارہی ہوگی۔ایسا معلوم ہوا کہ وہ غصے کے مارے پھٹ جائے گی''۔

ابوداؤاور ترمذی کی ایک طویل حدیث ہے جس میں یہ غور طلب الفاظ ہیں کہ جہنم کے بعض حصے بعض پر سوار ہیں اور آپس میں ایک دوسرے پر غالب اور مسلط ہیں (یعنی شدتِ غضب میں)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں: حضورﷺ نے فرمایا کہ جب کفار کو جہنم کی طرف گھسیٹا جائے گا تو جہنم چیخنے لگے گی اور ایک ایسی جھرجھری لے گی کہ تمام اہلِ محشر خوف زدہ ہوجائیں گے۔حضرت عبید بن عمیرؓ فرماتے ہیں کہ جب جہنم غصے سے تھرتھرائے گی، شوروغل، چیخ و پکار اور جوش وخروش شروع کرے گی تو تمام مقرب فرشتے اور بلند مرتبہ انبیاء کانپنے لگیں گے حتیٰ کہ خلیل اللہ حضرت ابراہیمؑ بھی اپنے گھٹنوں کے بل گرجائیں گے اور پکاریں گے کہ یا اللہ! میں آج تجھ سے صرف اپنی جان کی سلامتی چاہتا ہوں اور کچھ نہیں مانگتا (تفسیر ابن کثیر سورۃ الفرقان)

نبی اکرمﷺ کے فرمان کے مطابق جہنم اس قدر گہرا ہے کہ اگر ایک پتھر اس میں پھینکا جائے

تو وہ ستر سال تک گرتا ہی چلا جائے گا۔

قرآن پاک کے مطابق پتھر اور انسان جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ (سورۃ البقرہ۔۲۴)

ابن کثیر نے اس کی تفسیر میں متعدد روایات نقل کی ہیں کہ یہ پتھر گندھک کے ہوں گے، سیاہ گندھک کے بے حد بدبودار۔ ان پتھروں کی بدبو مردار سے بھی زیادہ ہوگی۔

جہنم کی حرارت کا یہ عالم ہے کہ نبی اکرمؐ کے فرمان کے مطابق دنیا کی آگ جہنم کے ستر حصے میں سے ایک ہے اور اگر سوئی کے ناکے کے برابر اس کی حرارت دنیا تک پہنچ جائے تو آنِ واحد میں سب کچھ بھسم ہو جائے (ستر کا عدد آپؐ نے عموماً کثرت کے معنوں میں استعمال کیا ہے)

جہنم کے سات مختلف طبقات ہیں یعنی "**الجحیم**" ہے، بھڑکی ہوئی آگ کا گڑھا۔ "الحطمہ" ہے، توڑ پھوڑ دینے والی، چکنا چور کر دینے والی۔ "ھاویہ" ہے یعنی گہری کھائی۔ "سقر" ہے یعنی شدید ترین انداز میں جھلسا دینے والی "لظی" ہے یعنی بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ۔ "سعیر" ہے یعنی دہکتی ہوئی آگ اور "زمھریر" ہے جس میں شدید ترین سردی ہے۔ جہنم کی ایک وادی کا نام "ویل" ہے۔ اس کی ایک جھلک سورۃ المرسلات (۷۷) کی ان آیات میں نظر آتی ہے:

(کافروں کو حکم ہوگا) چلو اس سائے کی طرف جو تین شاخوں والا ہے۔ نہ ٹھنڈک پہنچانے والا نہ آگ کی لپٹ سے بچانے والا۔ یہ آگ محل جیسی بڑی بڑی چنگاریاں پھینکے گی، یوں محسوس ہوگا جیسے زرد رنگ کے اُونٹ ہیں۔ ہلاکت اور بربادی ہوگی اُس روز جھٹلانے والوں کیلئے۔

(آیت ۳۰ تا ۳۴)

دلچسپ اور غور طلب بات یہ ہے کہ سائنس دانوں نے جو مختلف "کہکشائیں" دریافت کی ہیں، ان کی مختلف اقسام ہیں اور انہیں مختلف نام دیئے گئے ہیں۔

جہنم کے بارے میں قرآن و احادیث کی فراہم کردہ ان معلومات کو دیکھیے اور پھر امریکی خلائی ادارے ناسا کی جاری کی ہوئی تصاویر اور خبروں کا مطالعہ فرمایئے، آپ کو دونوں میں حیرت انگیز مشابہت نظر آئے گی اور یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی وقت محسوس نہیں ہوتی کہ یہ لازماً جہنم کے اشارات ہیں جو دنیا تک آپہنچے ہیں۔ چنانچہ "ہبل" کی ساری تصویروں میں مختلف گیسوں یعنی گندھک، ہائیڈروجن، آکسیجن اور نائٹروجن کا ذکر کثرت سے ہے۔ وہاں حرارت کا وہ عالم ہے کہ اس کے تصور سے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ وہاں کثافت کی یہ کیفیت ہے کہ چمچ بھر مواد کا وزن

اربوں ٹن ہے۔ وہاں شعلوں کی چیخم دھاڑ اس قدر بے پناہ ہے کہ انسانی کان اُس کی سماعت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ وہاں شعلے ایک دوسرے کو نگل رہے ہیں (جس کی تعبیر یوں کی گئی ہے کہ ایک کہکشاں دوسری کو نگل رہی ہے)۔

جہنم میں کھولتا ہوا پانی، پیپ اور خون ہوگا او رہبل کی تصویروں میں بھی سائنس دانوں نے غیر معمولی جسامت کے بلبلے اُٹھتے ہوئے دیکھے ہیں۔ وہاں بے حد و حساب جسامت کے شعلے بھڑکتے اور دہکتے ہیں جن کی چنگاریاں غیر معمولی ہیں (''محل جیسی''، ''زرد رنگ کے اُونٹوں جیسی'') اور نا سا کے سائنس دانوں نے انہیں نئے ستاروں کی پیدائش سے تعبیر کیا ہے۔

جہنم کے بعض مطبقے بے حد تاریک اور گہرے ہیں اور یہاں حرارت کا تناسب بہت ہی غیر معمولی اور لرزا دینے والا ہے اور یہی غالباً بلیک ہولز (Black Holes) ہیں۔ جو سائنس دانوں کے نزدیک ''مردہ ستاروں کا ملبہ'' ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے کہ جو شخص کسی کی ہاتھ برابر جگہ پر ناجائز قبضہ کرے گا جہنم میں اُس کے گلے میں سات زمینوں کے برابر طوق ڈالا جائے گا (بخاری)، کتاب الفتن۔ باب ۱۳۔ روایت سعید بن زید) اس حدیث کو دیکھیے اور پھر نا سا کے سائنس دانوں کی اس تحقیق پر غور فرمایئے کہ بلیک ہول میں کثافت کا یہ عالم ہے کہ وہاں چمچہ بھر مواد کا وزن کروڑوں ٹن (بلین ٹن) ہوگا۔ (خبر نمبر 4)

یوں لگتا ہے کہ بلیک ہول دراصل جہنم کے گڑھے ہیں جہاں ان ظالموں، جفا کاروں کو بند کیا جائے گا جنہوں نے خلق خدا پر ظلم کیے ہوں گے، انہیں تباہ و برباد کیا ہوگا اور اُن کے حقوق غصب کیے ہوں گے۔ وہاں اُن کے گلے میں تھوڑا سا مواد ڈالا جائے گا، لیکن اس کا وزن کروڑوں اربوں ٹن ہوگا اور وہ یوں محسوس کریں گے جیسے سات زمینیں اُن کی گردن کے ساتھ باندھ دی گئی ہیں۔

چنانچہ مجھے اس امر میں کوئی شبہ نظر نہیں آتا کہ ہبل کی تصویریں جہنم کے شعلے ہیں جبکہ بلیک ہول جہنم کے گڑھے ہیں اس کے سوا ان کی کوئی علمی، عقلی یا سائنسی توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ زمین پر گرمی تیزی سے کیوں بڑھ رہی ہے اور گلیشیر کیوں پگھلنے لگے ہیں؟

میں نے اوپر نا سا کے حوالے سے جو خبریں درج کی ہیں، اُن میں سے نمبر ۲ کو دوبارہ دیکھیے۔

اُمید ہے اس سوال کا جواب آپ کی سمجھ میں آ جائے گا۔فلکیات کے ماہرین سائنس دانوں کے مطابق سورج سے ایک کروڑ گنا روشن اور جسامت میں سینکڑوں گنا بڑا ایک ''ستارہ'' تیزی سے زمین کی طرف بڑھ رہا ہے۔جن سائنس دانوں نے ہبل کی تصویروں کا تجزیہ کر کے یہ رائے قائم کی ہے، وہ یہ بتاتے ہوئے خوف اور دہشت سے کانپ کانپ جاتے ہیں۔امریکی سرکاری حکام بھی اس بہت بڑے خطرے کے بارے میں اپنا منہ بند کیے ہوئے ہیں تا کہ لوگ دہشت زدہ نہ ہو جائیں۔

لیکن قیامت کے حوالے سے اتمامِ حجت کا ایک مضبوط قرینہ سامنے آ گیا ہے اور دہکتا، بھڑکتا غیر معمولی علاقہ جسے ناسا کے سائنس دان ''ستارہ'' کہہ رہے ہیں دراصل جہنم ہے جسے یوں لگتا ہے کہ اپنے اصل مقام سے دنیا کی طرف سفر کا حکم دے دیا گیا ہے اور وہ نہایت تیزی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔(سائنس دانوں کے اندازے کے مطابق یہ علاقہ دنیا سے چھ کروڑ نوری سال کے فاصلے پر ہے اور پانچ لاکھ نوری سال کی لمبائی میں پھیلا ہوا ہے)۔

قرآن مجید میں اس امر کی صراحت موجود ہے کہ جہنم گھات لگائے بیٹھا ہے۔سورۃ النباء ۷۸ میں ہے: ''بے شک جہنم گھات میں ہے، سرکشوں کا ٹھکانہ، اس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے'' (آیات ۲۱ تا ۲۳) ظاہر ہے جو چیز گھات میں ہوتی ہے وہ اپنے آپ کو دوسروں کی نظروں سے چھپا کر رکھتی ہے۔لوگ اُس سے بے فکر ہوتے ہیں اور وقت آنے پر اچانک پکڑے جاتے ہیں۔

جہنم کو بھی اللہ نے دنیا والوں سے چھپا کر، بہت دور کائنات کے بعید ترین گوشوں میں مستور رکھا ہے۔۔۔قرآن کے مطابق قیامت کے روز جہنم دنیا کے بالکل قریب آ جائے گی۔سورۃ الفجر (۸۹) میں ہے: ''جہنم اُس روز سامنے لے آئے جائے گی، اُس روز انسان کو سمجھ آئے گی لیکن اُس وقت سمجھنے کا کیا فائدہ ہو گا؟''۔(آیت ۲۳)۔۔۔چنانچہ جہنم اُس روز اہلِ زمین کے عین سامنے ہو گی اور اُس کی بھڑک، تندو تیزی، دہشت و وحشت اور دھاڑ کا یہ عالم ہو گا کہ جلیل القدر انبیاء تک شدید خوفزدہ ہو جائیں گے۔

متعدد احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ قیامت کا زمانہ بہت قریب آ گیا ہے اور جن معدودے چند لوگوں کو اللہ نے پیش بینی کی صلاحیت عطا فرمائی ہے، اُن کا بھی کہنا ہے کہ دنیا کی عمر بس اب

ڈیڑھ سو سال ہی رہ گئی ہے۔ پھر یہ بساط لپیٹ دی جائے گی اور قیامت لازماً برپا ہوگی۔

چنانچہ امکان یہ ہے کہ جہنم کو اپنے مرکز سے روانگی کا حکم مل چکا ہے اور ناسا کے سائنس دانوں کا تجزیہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے حد تیز روی کے ساتھ زمین کے قریب آ رہا ہے۔۔ اور اسی سبب سے زمین کے درجہ حرارت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور گلیشیر تیزی سے پگھلنا شروع ہو گئے ہیں۔ اس ضمن میں سائنسدانوں نے جو شواہد حاصل کیے ہیں، اُن کی چند خبریں ملاحظہ ہوں۔

۱۔☆ وائس آف امریکہ کے مطابق سلسلہ کوہِ ہمالیہ میں موجود گلیشیر خطرناک حد تک تیزی سے پگھل رہے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو آئندہ چالیس سال میں کوہِ ہمالیہ کے بیشتر گلیشیر ناپید ہو جائیں گے۔ جس کے نتیجے میں پہلے سیلاب آئیں گے اور پھر علاقے میں دریا خشک ہو جائیں گے۔ (روزنامہ ''دن'' لاہور ۱۱ جون ۱۹۹۹ء)

۲۔☆ واشنگٹن کے تحقیقی ادارے کے مطابق دنیا بھر میں گرمی بڑھنے سے ہمالیہ کی برف تیزی سے پگھلنے لگی ہے۔ گلیشیر پگھلنے سے پہلے تو دریائے گنگا اور دریائے سندھ میں سیلاب آئے گا اور پھر اگلے ۳۵ سال میں پانی کی مقدار خطرناک حد تک کم ہو جائے گی۔

(روزنامہ پاکستان ۲۵ جولائی ۲۰۰۰ء)

۳۔☆ گزشتہ تیس سالوں کے دوران دنیا بھر میں گرمی بڑھنے سے ہمالیہ کی برف تیزی سے پگھلنے لگی ہے۔ گلیشیر پگھلنے سے پہلے تو دریائے گنگا اور دریائے سندھ میں سیلاب آئے گا اور پھر اگلے ۳۵ سال میں پانی کی مقدار خطرناک حد تک کم ہو جائے گی۔

(روزنامہ پاکستان ۲۵ جولائی ۲۰۰۰ء)

۴۔☆ امریکہ کی نیشنل فاؤنڈیشن کے ایک جائزے کے مطابق بیسویں صدی کے آخری تیس سالوں میں قطبین پر درجہ حرارت گزشتہ چار سو سالوں میں سب سے زیادہ رہا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اس کے نتیجے میں دنیا میں زبردست ماحولیاتی تبدیلیاں آ سکتی ہیں۔

(''جنگ'' لاہور ۱۷ اگست ۲۰۰۰ء)

۵۔☆ امریکی خلائی ادارے ناسا کے مطابق قطبِ شمالی پر موجود برف اندازے سے زیادہ تیزی سے پگھل رہی ہے۔ ادارے کی تحقیقات کے مطابق برف ہر سال نو فیصد کی شرح سے پگھل

رہی ہے اور اگر یہی شرح قائم رہی تو صدی کے آخر تک یہاں کی ساری برف معدوم ہو جائے گی اور دیگر مسائل کے علاوہ عالمی درجہ حرارت غیر معمولی طور پر بڑھ جائے گا۔

(روزنامہ ''اُمت'' کراچی ۲۸ نومبر ۲۰۰۲ء)

۶۔☆چلی کے سائنس دانوں نے انکشاف کیا ہے کہ قطب جنوبی میں دنیا کا سب سے بڑا گلیشیر تیزی سے پگھلتا ہوا سمندر میں سرک رہا ہے اور اگر اس کے پگھلنے اور سرکنے کی یہی رفتار رہی تو سمندروں کی موجودہ سطح بلند ہو جائے گی۔ (''جنگ'' لاہور ۱۷ جنوری ۲۰۰۳ء)

۷۔☆سوئٹزرلینڈ کے سائنس دانوں نے کہا ہے کہ یورپ میں شدید گرمی کی لہر کا سلسلہ اس سال بھی جاری رہے گا۔۔۔واضح رہے کہ گزشتہ سال شدید گرمی سے یورپ میں سینکڑوں افراد مر گئے تھے اور براعظم کے مختلف ملکوں کے جنگلات میں آگ لگ گئی تھی۔۲۰۰۳ء کے موسم گرما میں یورپ میں کئی ہفتے مسلسل دن کے وقت ۳۰ ڈگری سینٹی گریڈ حرارت نوٹ کی گئی جب کہ کئی ملکوں میں ریکارڈ توڑ ۴۰ سینٹی گریڈ سے زیادہ گرمی نوٹ کی گئی جس کے سبب کئی جنگلات میں آگ لگ گئی، پانی کی شدید کمی کا سامنا کرنا پڑا جب کہ بہت سی انسانی ہلاکتیں بھی ہوئیں۔

(''اُمت'' کراچی ۱۴ جنوری ۲۰۰۴ء)

دنیا میں بڑھتی ہوئی گرمی کے نتیجے میں پہاڑوں کی برف پگھلے گی اور گلیشیر معدوم ہوں گے اور اُس کے نتیجے میں پہلے سیلاب آئیں گے اور پھر پانی کی قلت پیدا ہوگی تو اِن آفتوں اور بحرانوں کی ایک حکمت تو یہ ہو سکتی ہے کہ دنیا والوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے قوانین کے خلاف بغاوت پر جو کمر باندھ رکھی ہے، اس کی اُنہیں سزا دی جائے گی اور اُنہیں طرح طرح کی پریشانیوں اور دُکھوں میں مبتلا کیا جائے گا۔لیکن غور کرنے سے سمندر کے گلیشیر پگھلنے کا بڑا سبب یہ نظر آتا ہے کہ قیامت سے پہلے پہلے دنیا سے پہاڑوں اور سمندروں کی برف کا مکمل خاتمہ ضروری ہے۔۔۔قرآن میں ہے کہ قیامت آئے گی تو سمندروں میں آگ لگ جائے گی **واذا البحار سجرت** (جب سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے)(۸۲۔۳)۔

اور ایسا یوں ہوگا کہ پانی کے دو بنیادی اجزا یعنی آکسیجن اور ہائیڈروجن کو الگ الگ کر دیا جائے گا اور چونکہ ایک گیس جلنے والی جبکہ دوسری جلانے والی ہے، اس لئے سمندر فوراً ہی بھڑک اُٹھیں گے اور پانی بھک سے اُڑ جائے گا۔لیکن اس عمل کی تکمیل کیلئے ضروری ہے کہ قیامت سے

پہلے دنیا سے برف کا وجود معدوم ہو جائے اور سمندروں میں صرف پانی رہ جائے۔

قارئین گرامی! میں متذکرہ بالا معلومات کی روشنی میں اکثر سوچتا تھا کہ یہ تو جہنم کے اشارات تھے جو دنیا تک آ پہنچے ہیں اور ظاہر ہے جہنم میں چونکہ آگ ہے، حرارت ہے، شور ہے، اس لئے اس کے اشارات بہت دور تک پہنچ سکتے تھے لیکن دنیا تک جنت کے اشارات کی دسترس کیسے ہوگی۔ کہ وہاں تو باغات ہیں، نہریں ہیں، مرغزار ہیں۔۔۔تب اللہ نے کرم فرمایا اور روزنامہ ''جنگ'' لاہور کی ۴ جون ۱۹۹۴ء کی ایک خبر نے دل و دماغ اور روح کو اطمینانِ کامل سے سرشار و نہال کر دیا کہ ''زمین سے دو سو بلین یعنی بیس کروڑ نوری سال کے فاصلے پر سائنس دان پانی کی کثرت کو دیکھ کر حیران رہ گئے ہیں۔ یہ انکشاف امریکہ اور جرمنی کے سائنس دانوں نے ایک ریڈیائی دور بین استعمال کرتے ہوئے کیا''۔۔۔اور ظاہر ہے کہ یہ علاقہ جنت کا ہے کہ اس سے قبل سائنس دانوں کو پوری کائنات میں زمین کے سوا، پانی کا کہیں سراغ نہیں ملا اور جنت کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں نہروں اور آبشاروں کی کثرت ہے۔

قارئینِ گرامی! میں نے اپنی محدود سمجھ بوجھ اور دستیاب معلومات کی بنا پر عہدِ حاضر کے چند اہم سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ کرے آپ ان دلائل سے مطمئن ہوں اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی قدرتوں اور کمالات پر نہ صرف ہم سب کا ایمان مضبوط ہو جائے بلکہ ہم قیامت اور روزِ حشر کے حوالے سے کامل سنجیدگی اختیار کر لیں اور نتائج و عواقب کو بھگتنے کی تیاری بھی کر لیں۔ دیکھیے ''کتابِ زندہ'' ہمیں اس حوالے سے کیسے معجزانہ انداز میں خبردار کر رہی ہے۔

''کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور اُس کے نازل کردہ حق کے آگے جھک جائیں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی۔۔۔پھر ایک لمبی مدت اُن پر گزر گئی تو اُن کے دل سخت ہو گئے اور آج اُن میں سے اکثر فاسق بنے ہوئے ہیں۔ خوب جان لو کہ اللہ زمین کو اُس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ ہم نے نشانیاں تم کو صاف صاف دکھا دی ہیں، شاید کہ تم عقل سے کام لو''۔

(سورۃ الحدید ۵۷: آیات ۱۶، ۱۷)

حرب اسلامی اور دفاع پاکستان

(کرنل فضل ربی)

غزوۂ خیبر ۷ھ

پس منظر   مدینہ کے آس پاس آباد یہود نبی کریم ﷺ کے سخت دشمن تھے انہیں اپنی بد عہدی اور شرارتوں کے نتیجہ میں کئی دفعہ سزا ملی تھی۔ مگر یہ باز نہ آتے۔ لہٰذا صلح حدیبیہ کے نتیجہ میں نبی کریم ﷺ جونہی بڑے اور مضبوط دشمن (کفار مکہ) سے فارغ ہوئے تو آپ (ﷺ) نے مدینہ کے قرب و جوار میں ان قبائل کی طرف توجہ فرمائی۔ مشہور انگریز مستشرق (W.Montgomey Watt) نے اس غزوے کا بنیادی سبب کچھ اس طرح بتایا ہے۔

خیبر کے یہود اور خاص طور پر قبیلہ بنونضیر کے وہ سردار جن کو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ سے جلاوطن کردیا تھا آپ (ﷺ) کے خلاف اپنے دل میں سخت کینہ رکھتے تھے یہی لوگ تھے جنہوں نے عرب کے دوسرے قبائل کو اپنی دولت کے ذریعہ اکسا کر مسلمانوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا اور یہی وہ بنیادی سبب تھا جسکی وجہ سے محمد ﷺ نے خیبر پر لشکر کشی کی۔

غزوہ حدیبیہ کے لئے نکلے ہوئے چودہ سو صحابہ کرامؓ کو نبی کریم ﷺ نے محرم ۷ھ میں خیبر کی طرف روانہ فرمایا۔ اِس لشکر میں دو سو سوار اور ۲۰ بیس خواتین بھی شامل تھیں۔ صرف اِن سپاہ کو خیبر پر جانے کی اجازت مل سکی جو سفر حدیبیہ میں نبی کریم ﷺ کے ہم رکاب تھے۔

ارشاد ربانی ہے۔

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۔ (القرآن 48-15)

جب تم مال غنیمت حاصل کرنے کیلئے جانے لگو گے تو یہ پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ تم سے ضرور کہیں گے کہ ہمیں بھی ساتھ لے چلو۔

خیبر کے علاقے میں یہود کے جلاوطن قبیلے بنونضیر، بنوقریظہ اور بنوقینقاع آباد تھے۔ اِن

قبائل کا حلیف قبیلہ بنوغطفان بھی خیبر کے علاقے میں رہائش پذیر تھا۔تین دن کی مسافت کی بعد نبی کریم ﷺ خیبر کے قلعوں کے نزدیک پہنچ گئے ۔جہاں یہود پہلے سے مورچہ بند تھے۔نبی کریم ﷺ نے یہود اور بنوغطفان کے درمیان وادی رجیع میں پڑاؤ ڈال کر محاصرہ شروع کیا۔یہاں تک کہ آخری مضبوط قلعہ قموص بیسویں دن فتح ہوا۔اِس غزوے میں بہت سارا مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔جس کا ذکر قرآن مجید میں کچھ اِس طرح ہے۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ج (القرآن 20:48)

اللہ تم سے بکثرت اموالِ غنیمت کا وعدہ کرتا ہے۔جنہیں تم حاصل کرو گےفوری طور پر تو یہ فتح (فتح خیبر) اِس نے تمہیں عطا کردی اور لوگوں (بنوعطفان) کے ہاتھ تمہارے خلاف اُٹھنے سے روک دیئے۔

غزوہ خیبر میں نبی کریم ﷺ نے جو دفاعی تدابیر اختیار فرمائیں اِن کا تذکرہ مندرجہ ذیل ہے:۔

نقل وحرکت میں رازداری (SECRECY OF MOVE)

مسلم فوج رات کے وقت خیبر میں اتنی رازداری کے ساتھ داخل ہوئی کہ یہود کو بالکل پتا نہ چل سکا۔اہل خیبر کو رات کے وقت نبی کریم ﷺ کی فوج نے محاصرے میں لے لیا تھا۔مگر صبح سویرے جب کسان اور مزدور اپنے اپنے کاموں کیلئے جا رہے تھے،تو دیکھا کہ اِسلامی فوج قلعوں کے ساتھ لڑائی کیلئے کھڑی ہے۔چنانچہ روایت ہے۔

عن انس بن مالك ان رسول الله ﷺ غزا خيبر قال فصلينا عندها صلوٰة الغداة بغلس۔ (صحیح مسلم)

حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کا جہاد کیا تو ہم نے صبح کی نماز خیبر کے پاس اندھیرے میں پڑھی۔اندھیرے اور بے خبری میں دشمن کو جا لینے سے نبی

کریم ﷺ نے مدمقابل کو جارحانہ کاروائی سے باز رکھ کر محض اپنے دفاع پر مجبور کیا۔

مخالف قوت کی تفریق

خیبر پر حملہ کی غرض سے نبی کریم ﷺ جب مدینہ سے نکلے تو سیدھے راستے اور رُخ کی بجائے نبی کریم ﷺ نے غیرمعروف (UN-KNOWN) راستے سے لشکر کو گزار دیا۔ یہ راستہ یہود اور بنو غطفان کی آبادی کے درمیان میں واقع تھا۔ دونوں قبائل کے درمیان سے گزرنے کے باعث دشمن تذبذب میں پڑ گیا۔ ہر ایک کو اپنے اوپر حملے کا خطرہ ہوا۔ اور یوں وہ اپنے اپنے دفاع میں مصروف ہو کر مشترکہ طور پر کسی بھی کاروائی کے اہل نہ رہے۔

دشمن پر مکمل غلبہ

غزوہ خیبر کے دوران یہود نے اپنے علاقے میں موجود مختلف قلعوں میں پناہ لی تھی۔ اِن قلعوں میں سلالم، ناعم، قموص نطاۃ اور مربطہ مشہور ہیں۔ مسلمان سپاہ یکے بعد دیگرے قلعے فتح کرتے رہے یہود بھاگ کر دوسرے قلعے میں محفوظ ہو جاتے اور اپنی قوت کو یکجا کر کے نئی حکمت عملی نبی کریم ﷺ کے اقدام سے بچنے کے لئے اختیار کر لیتے۔ نبی کریم ﷺ نے اِن کا باقاعدہ تعاقب جاری رکھا اور آخری مضبوط قلعے قموص میں انہیں محصور رکھا یہاں تک کہ انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور صلح کی درخواست کی۔ اِس سنت سے ہمیں دشمن کو آخری دفاعی مورچہ سے نکالنے کی اہمیت کا پتہ لگتا ہے۔ (جاری)

> صاحب جلال ہونا کچھ اچھی بات نہیں۔ ہم کو ہر بات میں حضور نبی کریم کی عادات وخصائل اور اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ یاد رہے کہ حضور اکرمؐ سراپا جمال تھے۔ (چراغ راہ۔146)

مذہب اور جدید چیلنج

(مولانا وحید الدین خاں)

تمدن

اسلام میں قتل عمد کی سزا موت ہے الا یہ کہ مقتول کے ورثاء خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں، لیکن جدید دور ترقی میں جہاں مذہب کی اور تعلیمات کے خلاف ذہن پیدا ہوا اسی طرح سزائے قتل کے بارے میں بھی سخت تنقیدیں کی جانے لگیں، ان حضرات کا خاص استدلال یہ ہے کہ اس قسم کی سزا کا مطلب یہ ہے کہ ایک انسانی جان ضائع ہونے کے بعد دوسری انسانی جان کو بھی کھو دیا جائے، پچھلے برسوں میں اکثر ملکوں میں اس رجحان نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے اور پھانسی کی بجائے قید کی سزائیں تجویز کی جا رہی ہیں۔

اسلام نے قاتل کی جو سزا مقرر کی ہے، اس میں دو اہم ترین فائدے ہیں، ایک یہ کہ ایک شخص نے سوسائٹی کے ایک فرد کو قتل کر کے جس برائی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی جڑ آئندہ کیلئے کٹ جائے، مجرم کا یہ عبرتناک انجام دیکھ کر دوسرے لوگ آئندہ اس قسم کی ہمت نہ کر سکیں، اسی کے ساتھ دیت کی جو صورت ہے، اس میں گویا اسلام نے نتائج کا لحاظ کیا ہے، مثلاً اگر کسی کے والدین بوڑھے ہوں اور ان کا اکلوتا بیٹا قتل ہو جائے تو وہ بے سہارا رہ جاتے ہیں، ایسی حالت میں قاتل کو سزائے موت بھی مل جائے تو انہیں کیا فائدہ، اسلام نے ایسے والدین کی تلافی کیلئے یہ طریقہ رکھا ہے کہ قاتل کے ورثاء مقتول کے والدین کو ایک خاص رقم بطور خوں بہا دے کر انہیں راضی کر لیں اور وہ قتل کو معاف کر دیں، اس صورت میں مقتول کے بوڑھے والدین کو مثلاً دس ہزار روپے کی رقم مل جائے، اور وہ اس رقم سے اپنی گزر بسر کا انتظام کر سکیں گے۔ مخصوص حالات میں ریاست کو بھی یہ حق ہے کہ وہ دیت کی رقم میں اضافہ کر دے تا کہ بے سہارا ورثاء خسارے میں نہ رہیں۔

یہ ایک نہایت حکیمانہ قانون ہے اور اس کا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ جہاں رائج ہوا قتل کا خاتمہ ہو گیا اس کے برعکس جن ممالک میں سزائے موت کو منسوخ کیا گیا ہے وہاں جرائم گھٹنے کی بجائے بڑھ گئے ہیں، اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ ایسے ممالک میں قتل کی وارداتوں میں بارہ فیصد تک اضافہ ہو گیا ہے، چنانچہ اس کی بھی مثالیں موجود ہیں کہ پہلے سزائے موت کو منسوخ کیا گیا اس

کے بعد نتائج دیکھ کر دوبارہ اسے بدل دیا گیا، سیلون اسمبلی نے ۱۹۵۶ء کو جب ایک قانون پاس کیا، جس کے مطابق سیلون کی حدود میں موت کی سزا کو ختم کر دیا گیا، اس قانون کے نفاذ کے بعد سیلون میں جرائم تیزی سے بڑھنا شروع ہو گئے، ابتداء لوگوں کو ہوش نہیں آیا مگر ۲۶ ستمبر ۱۹۵۹ء کو جب ایک شخص نے سیلون کے وزیر اعظم بندرا نائک کے مکان میں گھس کر نہایت بے دردی سے قتل کر دیا تو سیلون کے قانون سازوں کی آنکھ کھلی اور وزیر اعظم کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے فوراً بعد سیلون اسمبلی کا ہنگامی اجلاس ہوا، جس میں چار گھنٹے کے بحث و مباحثہ کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ سیلون کی حکومت ۱۹۵۶ء کے قانون کو منسوخ کر کے ملک میں سزائے موت کو دوبارہ جاری کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔

معیشت

مذہب، معاشیات کی جو تنظیم کرتا ہے، اس میں ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے بلکہ اس کا سارا ڈھانچہ بنیادی طور پر، انفرادی ملکیت کے اوپر قائم ہے، یہ نظام عرصہ تک باقی رہا ہے۔ مگر صنعتی انقلاب کے بعد یورپ میں انفرادی ملکیت کے اصول پر زبردست تنقیدیں شروع ہوئیں، یہاں تک کہ تعلیم یافتہ طبقہ کی عام فضا اس کے خلاف ہو گئی، انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کے درمیان سو برس تک ایسی فضا رہی گویا انفرادی ملکیت ایک مجرمانہ قانون تھا، جو دورِ وحشت میں انسانوں کے درمیان رائج ہو گیا اور اب جدید علمی ترقی نے اجتماعی ملکیت کا اصول دریافت کیا ہے، جو معاشیات کی بہتر تنظیم کیلئے اعلیٰ ترین اصول ہے۔

اس کے بعد تاریخ میں پہلی بار اجتماعی ملکیت کے نظام کا تجربہ شروع ہوا، زمین کے ایک بڑے حصے میں اس کو نافذ کیا گیا، اس کے حق میں بڑے بڑے دعوے کئے گئے، بڑی بڑی اُمیدیں باندھی گئیں، مگر طویل تجربہ سے ثابت ہو گیا کہ اجتماعی ملکیت کا نظام نہ صرف یہ کہ غیر فطری ہونے کی وجہ سے اپنے قیام کیلئے تشدد پیدا کرتا ہے، نہ صرف یہ کہ وہ انسان کی ہمہ جہتی ترقی میں مانع ہے، نہ صرف یہ کہ سرمایہ داری سے بھی زیادہ ایک مرکوز اور جابرانہ نظام کا موجب ہے بلکہ خودی وہ زرعی اور صنعتی پیداوار بھی اس میں ملکیتی نظام کے مقابلے میں کم حاصل ہوتی ہے، جس کیلئے آزادی اور ہمہ جہتی ترقی کی قربانی دی گئی تھی۔

یہاں میں روس کی مثال دوں گا، روس کی تمام زمینیں اس وقت سرکاری ملکیت میں تبدیل کی جا چکی ہیں اور پورے ملک میں ''اجتماعی انتظام'' کے تحت کاشت کی جاتی ہے، ساری زمینیں سرکاری اور پنچایتی فارم کی صورت میں ہیں، نہ کہ نجی ملکیت کی صورت میں، البتہ ۱۹۳۵ء کے فیصلہ کے مطابق ہر کسان کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے رہائشی مکان سے متصل اپنے ذاتی استعمال کیلئے ایک تہائی یا نصف ایکڑ اور بعض مخصوص صورتوں میں دو ایکڑ تک زمین پر قبضہ رکھ سکتا ہے، اسی طرح اسے یہ بھی حق ہے کہ اپنے مکان میں محدود تعداد میں گائے، بکری، بھیڑ اور مرغی وغیرہ پالے، ۱۹۶۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق روس میں کل زیر کاشت رقبہ ۲۰۴ ملین ہیکٹر (Hectares) تھا، جس میں نجی رقبہ کی مجموعی مقدار چھ ملین ہیکٹر تھی، یعنی کل زیر کاشت زمین کا صرف تین فیصدی حصہ، مگر ۱۹۶۱ء میں آلو کی پیدوار کا جو تناسب تھا وہ حسب ذیل تھا۔

	زیر کاشت زمین	پیدوار
اجتماعی رقبہ	۴۳،۵،۲،۰۰۰	۳،۰۸،۰۰،۰۰۰ ٹن
نجی رقبہ	۴۵،۲۶،۰۰۰	۵،۳۵،۰۰،۰۰۰ ٹن

اس طرح نجی رقبہ پر پیدا ہونے والے آلو کی مقدار گیارہ ٹن فی ہیکٹر تھی، جبکہ سرکاری فارموں میں یہ مقدار صرف سات ٹن فی ہیکٹر تھی، حالانکہ سرکاری فارموں کو جدید زرعی مشینیں، موزوں زمین اور معدنی کھاد وغیرہ کی وہ سہولتیں حاصل تھیں جن سے نجی رقبے قدرتی طور پر محروم تھے، اسی قسم کا تناسب دوسرے اجناس کی پیداوار میں بھی پایا جاتا ہے۔

مویشیوں کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب ہے، چارہ کی کمی اور ناقص دیکھ بھال کی وجہ سے سرکاری فارموں میں کثرت سے جانور مر رہے ہیں چنانچہ صرف ایک ریاست میں ۱۹۶۲ء کے گیارہ مہینوں میں مجموعی طور پر تقریباً ایک لاکھ ۷۰ ہزار مویشی مر گئے، اس کے مقابلے میں ہر قسم کی دشواریوں کے باوجود نجی طور پر پالے ہوئے مویشیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، اور بااعتبار تناسب وہ سرکاری فارم جو کل تعداد کا ۷۵ فی صدی مرغیوں اور مویشیوں کے مالک ہیں، انہوں نے نجی ذرائع کے مقابلے میں صرف دس ۱۰ فیصدی زیادہ گوشت فراہم کیا اور انڈے میں تو نجی پیدوار نے بہت پیچھے چھوڑ دیا، ۱۹۶۱ء کے اعداد و شمار ملاحظہ ہوں۔

	اجتماعی رقبہ	نجی رقبہ
گوشت	۴۸,۰۰,۰۰۰ ٹن	۳۹,۰۰,۰۰۰ ٹن
دودھ	۳,۴,۰۰,۰۰۰ ٹن	۲,۸۵,۰۰,۰۰۰ ٹن
انڈا	۶۳۰۰ ملین	۲۳,۰۰۰ ملین
اون	۲,۸۷,۰۰۰ ٹن	۷۹,۰۰۰ ٹن

حتیٰ کہ یہ محدود نجی ذرائع خود حکومتی مرکزوں کو غذائی اشیاء سپلائی کرتے ہیں، چنانچہ ۱۹۶۲ء میں صرف ایک ریاست میں حکومت نے اپنے دفاتر کا ۲۶ فیصدی آلو اور ۳۴ فیصدی انڈا نجی فارموں سے حاصل کیا ہے اور اسی طرح دوسری چیزیں۔

(Bulletion (Germany) Novembr 1963.)

اس اجتماعی ملکیت کا آخری انجام یہ ہے کہ روس جو زار کے زمانے میں، جبکہ وہاں نجی ملکیت کا نظام رائج تھا، اناج کے معاملے میں دنیا کے چند بڑے برآمدی ملکوں میں سے تھا، اس نے ۱۹۶۳ء میں کناڈا، آسٹریلیا اور امریکہ سے پندرہ ملین ٹن گیہوں خریدا ہے اور یہ صورتِ حال مسلسل جاری ہے، چنانچہ ۵۶ ۔ ۱۹۶۴ء میں اس نے امریکہ سے بارہ لاکھ پچاس ہزار ٹن غلہ خریدا ہے، اسی طرح بعد کے سالوں میں بھی یہی حال دوسرے اشترا کی ملک چین کا بھی ہے۔

(BULLETION OCT. 1963)

اس تجربے سے معلوم ہوا کہ مذہب کا قانون جس ذہن سے نکلا ہے، وہ انسانی فطرت کو زیادہ جاننے والا ہے، اور اس کے مسائل کو زیادہ گہرائی کے ساتھ سمجھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کچھ جو تمدن کی تعمیر کیلئے ہمیں درکار ہے، اس کا واحد اور حقیقی جواب صرف مذہب کے پاس ہے، مذہب ہمیں حقیقی قانون سازی کی طرف رہنمائی کرتا ہے، وہ قانون کی موزوں ترین اساس فراہم کرتا ہے، وہ زندگی کے ہر معاملے میں وہ صحیح ترین بنیاد دیتا ہے، جس کی روشنی میں ہم زندگی کا مکمل نقشہ بنا سکیں، وہ حاکموں اور محکوموں کے درمیان قانونی مساوات پیدا کرنے کی واحد صورت ہے، وہ قانون کیلئے وہ نفسیاتی بنیا د فراہم کرتا ہے، جس کی عدم موجودگی میں قانون عملاً بے کار ہو کر رہ جاتا ہے، وہ سوسائٹی کے اندر وہ موافق فضا پیدا کرتا ہے، جو کسی قانون کے نفاذ کیلئے ضروری ہے، اس طرح مذہب ہمیں وہ سب کچھ دیتا ہے، جس کی ہمیں اپنے تمدن کی تعمیر کیلئے ضرورت ہے، جبکہ لامذہبیت ان میں سے کچھ بھی نہیں دیتی اور نہ حقیقتاً دے سکتی ہے۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی انفرادیت

1۔ دوسرے سلسلوں کی روحانی معراج اور آخری منزل کشف و کرامات کا حصول ہے لیکن ہمارے سلسلہ میں اُنکی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ہمارے سلسلہ کا آخری مقصد اللہ کا قرب، عرفان اور لقاء کا حصول ہے۔

2۔ بزرگان عظام اور اولیائے کرام کی کرامات برحق اور انکی دعاؤں کی مقبولیت مسلم لیکن ہم مشکل کشاء اور حاجت روا صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو مانتے ہیں۔

3۔ موجودہ دور کی مصروف زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے مختصر اور سہل اوراد واذکار تلقین کیئے جاتے ہیں۔

4۔ ہمارے سلسلہ میں مجاہدہ کیلئے غصہ اور نفرت کو مکمل طور پر نفی کرنے اور عالمگیر محبت اور صداقت کو اختیار کرنے کی مشق کروائی جاتی ہے۔ یہ تربیت گھر کی چار دیواری کے اندر احسن طریقے سے ہوسکتی ہے۔

5۔ بانی سلسلہ توحیدیہ کے وصیت نامہ کے مطابق سلسلہ توحیدیہ کے روحانی پیشوا کا منصب ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غیر وارثتی ہوگا۔

6۔ سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی تعلیم مذہبی گروہ بندیوں اور فرقہ واریت سے بالاتر اور وسعت قلب و نظر کی مظہر ہے۔

7۔ ہمارے سلسلہ میں مریدوں کی تعداد بڑھانے کیلئے اندھا دھند بیعت نہیں کیا جاتا ہر شخص کو بیعت کرنے سے پہلے کم از کم چھ ماہ طالب رکھا جاتا ہے تا کہ وہ جماعت کے مقاصد سے اچھی طرح آگاہ ہو کر داخل سلسلہ ہو۔

8۔ سلسلہ توحیدیہ میں متوازی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ جس میں نہ تو دنیا کو ترک کرنے کی اجازت ہے اور نہ ہی اِس میں غرق ہو جانے کی۔

Monthly **FALAH-E-ADMIYYAT**

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی شہرہ آفاق تصانیف

قرون اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات
اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار
ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع
اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور
واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور نفسیاتی
اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔

کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ
اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔
سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔
زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔
تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔
سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔

یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے
تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ
کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی
مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں وہ تمام
اوراد و اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں جس پر عمل کر کے
ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔

وحدت الوجود کے موضوع پر یہ مختصر سی کتاب نہایت ہی اہم دستاویز ہے۔
مصنفؒ نے وحدت الوجود کی کیفیت اور روحانی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان
زبان میں بیان کر دیا ہے۔ آپ نے جن دیگر موضوعات پر روشنی ڈالی ہے وہ یہ ہیں:۔
حضرت مجدد الف ثانیؒ کا نظریہ وحدت الشہود، انسان کی بقا اور ترقی کیلئے دین
کی اہمیت اور ناگزیریت، بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا
اور روحانی سلوک کے دوران بزرگان عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔

Website: www.toheedia.net